جلد ۸۲ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۸ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۸ء نمبر ۳

مضامین

مضمون	مضمون نگار	صفحات
شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۶۱-۱۶۴

مقالات

مضمون	مضمون نگار	صفحات
مدارج سلوک	ڈاکٹر میر ولی الدین صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ	۱۶۵-۱۸۰
ملکۂ نورجہاں کے سلسلۂ مادری و پدری کے اہم افراد	ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۸۱-۱۹۵
قاسم کاہی کا وطن	جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے لکچرار عربی، الہ آباد یونیورسٹی	۱۹۶-۲۱۰
میر احمد علی رسا رام پوری	جناب راز یزدانی رام پوری	۲۱۱-۲۲۰

وفیات

مضمون	مضمون نگار	صفحات
نواب محمد اسمٰعیل خاںؒ	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۲۲۱-۲۳۳

ادبیات

مضمون	مضمون نگار	صفحات
غزل	جناب مرزا احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڈھ	۲۳۴-۲۳۵
"	جناب فضا ابن فیضی	۲۳۵
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۲۳۶-۲۴۰

شذرات

انگریزوں نے اپنے زمانہ میں حکومت کے مصالح کی بنا پر ہندوستان کی تاریخ کو عمداً مسخ کیا اور ایسی تاریخیں لکھیں جن سے ہندو مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو، اس کا احساس اس زمانہ کے ارباب نظر کو ہو گیا تھا، اور انھوں نے اسکے تدارک کی کوشش بھی کی، چنانچہ علامہ شبلی نے اس سلسلہ میں بڑے معرکۃ الآرا مضامین لکھے، اسلیے دار المصنفین کو ابتدا ہی سے اسکا احساس تھا اور یہاں سے بکثرت ایسے مضامین لکھے گئے جن سے ہندو مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیاں دور اور ان میں اتفاق و اعتماد پیدا ہو، سید صاحب نے اس مقصد کے لیے "عرب ہند کے تعلقات" جیسی اہم اور ضخیم کتاب لکھ دی، دار المصنفین کے پیش نظر تاریخ ہند کا جو سلسلہ ہے اس میں خاص طور سے اس مقصد کو سامنے رکھا گیا ہے اور اس سلسلہ کی پہلی کتاب "ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک" کے نام سے گذشتہ مہینہ شائع ہو گئی ہے، اس میں ہندو مسلمان مورخین کی کتابوں کے وہ تمام اقتباسات جمع کر دیے گئے ہیں جن سے اس عہد کے سیاسی، اقتصادی، تجارتی، تمدنی اور معاشرتی حالات معلوم ہوتے ہیں، اور مسلمانوں کی تاریخ کے روشن پہلو ہندوؤں کی زبان سے اور ہندوؤں کے علمی و تمدنی کارنامے مسلمانوں کے قلم سے نقل کیے گئے ہیں۔

~~~~~~~~~~

اس سے انکار نہیں کہ ہندوستان کے اسلامی عہد میں بعض حکمرانوں سے قابل اعتراض افعال بھی سرزد ہوئے اور ہندوؤں پر ظلم و زیادتی کے بھی کچھ واقعات مل جائیں گے مگر اسکو اختلاف مذہب کا نتیجہ قرار دینا اور مذہب اسلام اور پوری مسلمان قوم کو متہم کرنا صحیح نہیں ہے، کیا مسلمان بادشاہوں نے مسلمانوں پر زیادتیاں نہیں کیں، اور خود انکی تلواریں آپس میں بے نیام نہیں ہوئیں، یا ہندو حکمراں ہندوؤں کیلیے خیر مجسم تھے اور ان کا دامن ظلم و زیادتی سے بالکل پاک ہے۔

اصل یہ ہے کہ حکومت و سیاست میں ہندو مسلم کا کیا سوال، بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے جس سے کسی قدیم حکمراں خاندان کی تاریخ خالی نہیں، اور اگر بالفرض کسی حکمراں نے مذہب کے نام سے کوئی زیادتی کی بھی تو دیکھنا چاہیے کہ خود مذہب اسکی اجازت کہاں تک دیتا ہے، محض کسی دنیاوی بادشاہ کے عمل کی ذمہ داری مذہب پر نہیں ڈالی جا سکتی،

شذرات — ۱۶۳ — معارف نمبر ۳ جلد ۸۲

اس لیے اس قسم کے جو واقعات پیش بھی آئے ان کو ہندو مسلم نقطۂ نظر سے دیکھنا صحیح نہیں ہے، پھر ان واقعات کے مقابلہ میں مسلمان بادشاہوں کے کارناموں، انکی علمی و تمدنی خدمات اور ان کی عدل پروری کا پلہ اتنا بھاری ہے کہ ان شاذ و نادر واقعات کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔

~~~~~~~~~~

آزادی اپنے ساتھ بہت سی ذمہ داریاں لاتی ہے، عہد غلامی کے بہت سے خیالات اور سوچنے کے طریقوں کو بھی بدلنا پڑتا ہے اور ایک آزاد اور نئے ملک کی تعمیر کے لیے ان ہی چیزوں کو کام میں لایا جاتا ہے جو اس کے استحکام و ترقی میں معاون ہوں، اس لیے اب تاریخ میں بھی پرانے نقطۂ نظر کو بدلنے کی ضرورت ہے، اور آج پرانے قصوں کو دہرانے سے اسکے سوا کچھ حاصل نہیں ہے کہ ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کی دور غلامی کی یادگار کو قائم رکھا جائے جو کسی حیثیت سے بھی ہندوستان کے لیے مفید نہیں ہے، پھر ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کے اتنے پہلو ہیں کہ ان کو چھوڑ کر اختلافی مسائل کو چھیڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے، ہماری رائے میں تو ہندوستان کی جو تاریخیں بھی لکھی جائیں خواہ وہ نصابی ہوں یا غیر نصابی انکی نگرانی کیلیے ہر صوبہ میں وسیع القلب ہندو مسلمانوں کا ایک بورڈ ہونا چاہیے جس کی جانچ کے بغیر انکی اشاعت کی اجازت نہ ہو۔

~~~~~~~~~~

ستمبر کے فاران میں حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کسی عقیدت مند نے معارف کے سلیمان نمبر پر مبسوط تبصرہ کیا ہے اور اس میں حیات سلیمانی کی تالیف کے متعلق بھی مشورے دیے ہیں، غالباً یہ وہی مخلص ہیں جو صدق جدید میں بھی اکثر اس مسئلہ کیجانب توجہ دلا چکے ہیں، وہ عقیدت مندی کے حجاب میں ایسے مستور ہیں کہ ان کا پہچاننا مشکل ہے، مگر انداز تحریر غماز کر رہا ہے کہ ان کو سید صاحب اور دار المصنفین سے قریبی تعلق ہے، اور وہ خود بھی صاحب ذوق و نظر ہیں جس پر انکی تحریر شاہد ہے، اگر وہ پردے کی آڑ سے باتیں نہ کرتے تو ان سے براہ راست باتیں کرنے کا موقع ملتا اور ان کے مشوروں سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا۔ انھوں نے سلیمان نمبر کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور حیات سلیمانی کے متعلق جو مفید مشورے دیے ہیں اسکے لیے ہم شکر گذار ہیں، مگر انھوں نے اس سلسلہ میں جن بزرگوں اور دوستوں کے نام لیے ہیں ان میں بزرگوں سے مشورے کے علاوہ اور کسی قسم کی مدد نہیں مل سکتی، اس کا پورا تجربہ سلیمان نمبر میں ہو چکا ہے، اور بعض دوستوں سے جس قسم کی مدد مل سکتی ہے اسکی ضرورت نہیں، مگر یہ دار المصنفین کا ایسا فرض ہے جس کا ادا کرنا بہرحال ضروری ہے، اسلیے خدا کا نام لیکر راقم نے حیات سلیمانی لکھنا شروع کر دی ہے اور سید صاحب کی ابتدائی زندگی سے لیکر پونا کی پروفیسری بلکہ مولانا شبلی کی وفات تک کے حالات لکھے جا چکے ہیں،
~~~~~~~~~~

اور دار المصنفین کے قیام کے بعد کے حالات جو سید صاحب کے کارناموں اور ان کے عروج و کمال کا اصلی زمانہ ہے، اب لکھے جائیں گے، اس میں شبہ نہیں کہ یہ کام کئی آدمیوں کے مل کر کرنے کا ہے، مگر جب اس کی کوئی شکل نہیں نظر آئی تو مجبوراً تنہا اس بار کو اٹھانا پڑا، اور جب شروع ہو گیا ہے تو انشاء اللہ کسی نہ کسی شکل ہی میں پورا ہو جائے گا، پھر تکمیل کے بعد بزرگوں اور دوستوں کے مشورے سے ترمیم و اصلاح ہوتی رہے گی،

گذشتہ مہینہ ہم نے مسلم یونیورسٹی پر جو شذرات لکھے تھے، ان کو عام طور پر پسند کیا گیا، اور اظہار پسندیدگی کے متعدد خطوط آئے، مگر اسی کے ساتھ بعض دوستوں نے جو مسلم یونیورسٹی کے حقیقی ہمدرد و ہوا خواہ ہیں، اس کی بعض خامیوں اور اصلاح طلب پہلوؤں کی جانب بھی توجہ دلائی اور یہ لکھا ہے کہ "جس اصول پر معارف نے مسلم یونیورسٹی کو سیکولر بنانے کی مخالفت کی ہے اور اس کی تہذیبی خصوصیات و ملی روایات کو باقی رکھنے کا مشورہ دیا ہے، اسی اصول پر اس کو ان چیزوں کی بھی مخالفت کرنا چاہیے جو ان خصوصیات و روایات کے خلاف یونیورسٹی میں رائج ہوں"، یہ مطالبہ معقول و مناسب ہے، اگر یونیورسٹی میں واقعی ایسی کوئی چیز پائی جاتی ہے تو بلاشبہ وہ قابل اصلاح ہے، اور اس سے یونیورسٹی کو پاک کرنا ضروری ہے، مگر ہم کو اس کا کوئی ذاتی علم نہیں ہے، اس لیے سردست اسکے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے، تحقیق کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو آئندہ اس مسئلہ پر لکھا جائے گا۔

حکومت ہند نے اس سال سے مشرقی زبانوں کے ماہروں اور ان کے علمی خدمات کے اعتراف کے لیے ایک نیا اعزاز قائم کیا ہے، اور صدر جمہوریہ ایسے اصحاب علم کو جنھوں نے ان زبانوں میں کوئی علمی کارنامہ انجام دیا ہو ایک سند عطا کرتے ہیں، چنانچہ اس سال یوم آزادی کے موقع پر عربی زبان کی سند ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی کو ملی ہے جو ہر لحاظ سے اس اعزاز کے مستحق ہیں، ہم ڈاکٹر صاحب کو اس اعزاز اور حکومت کو اسکی علم نوازی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

مقالات

مدارج سُلوک

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

(۲)

ان احادیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعثت کا مقصود ہی یہ ہے کہ خلق اللہ کو دنیا کی طرف سے پھیر کر آخرت کی طرف متوجہ کریں، ہم نے اوپر چند آیات قرآنی و احادیث نبوی سے استشہاد کیا ہے، آخر میں مشائخ طریقت کے چند اقوال اس باب میں پیش کرتے ہیں:

فضیل بن عیاض کہا کرتے تھے:

طالت فکرتی فی هٰذه الآية
إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً
لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا
وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا
جُرُزًا (کہف)

یعنی اس آیت پر میں بہت فکر کرتا ہوں کہ جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اس کو اسکی زینت کے لیے اس لیے بنایا ہے تاکہ لوگوں کو جانچیں کہ ان میں سے کون اچھا کام کرتا ہے اور ایک روز اس سب کو چھانٹ کر چٹیل میدان بنا دینگے۔

اس سلسلہ میں ایک روز ابن عمرؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اَحْسَنَ عَمَلاً کون لوگ ہیں؟ فرمایا:

احسنکم عقلاً اورعکم عن	یعنی جس کی سمجھ اچھی ہو، حرام سے زیادہ
محارم اللہ واسرعکم فی طاعۃ	پرہیز کرے اور حق تعالیٰ کی فرماں برداری
سبحانہ	کی طرف زیادہ جھپٹے۔

اس آیت کریمہ کا جس پر حضرت فضیل زیادہ غور کیا کرتے تھے یہی مفہوم ہے کہ جو لوگ دنیا کے بناؤ سنگھار پر ریجھ رہے ہیں وہ خوب سمجھ لیں کہ ان کا یہ زرق برق زیادہ دنوں باقی رہنے والی چیز نہیں، دنیا کے زمینی ساز و سامان خواہ وہ کتنے ہی جمع کر لیں اور مادی ترقی سے ساری زمین کو لالہ و گلزار کیوں نہ بنا دیں، جب تک ہدایت ربانی و دولت روحانی سے تہی دست رہیں گے، سرور و طمانینت، ابدی نجات و فلاح سے ہم آغوش نہیں ہو سکتے، آخری و دائمی کامیابی صرف ان کے لیے ہے جو مولائے حقیقی کی خوشنودی پر دنیا کی ہر ایک زائل و فانی خوشی کو قربان کر سکتے ہیں، اور راہ حق کی جادہ پیمائی میں کسی صعوبت سے نہیں گھبراتے، نہ دنیا کے بڑے بڑے طاقت ور جباروں کی تخویف و ترہیب سے ان کا قدم ڈگمگاتا ہے!

مشائخ طریقت نے دنیا کی مثال سایہ سے دی ہے، سایہ متحرک ساکن ہے، یعنی حقیقت میں متحرک ہے اور ظاہر میں ساکن، اس کی حرکت ظاہری نگاہ سے نہیں محسوس ہوتی بلکہ بصیرت باطن سے دریافت ہوتی ہے! ایک مرتبہ دنیا کا ذکر حضرت حسن بصری کے سامنے کیا جا رہا تھا، آپ نے فرمایا:

احلام نوم او کظل زائل	ان اللبیب بمثلہا لا یخدع

یعنی دنیا کی مثال خواب کی سی ہے یا زوال پذیر سایہ کی سی، عقلمند اس جیسی چیز سے دھوکا نہیں کھاتا!

حضرت امام حسنؓ یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے:

یا اھل للذات دنیا لا بقاء لھا	ان اغترار بظل زائل حمق!

اے لذات دنیا کے پرستارو دیکھو ان کو بقا نہیں، زوال پذیر سایہ سے دھوکا کھا جانا حماقت ہے!

کہتے ہیں کہ ایک زاہد نے خواب میں دنیا کو ایک باکرہ کی شکل میں دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر اس سے پوچھا کہ تو باوجود اس حسن و زینت کے اور باوجود ہزاروں شوہر رکھنے کے باکرہ کیسے رہ سکی؟ دنیا نے کہا کہ کیا میں تجھ سے سچی بات کہہ دوں؟ سچ تو یہ ہے کہ حقیقت میں کسی مرد نے میری طرف توجہ ہی نہیں کی اور سیکڑوں نامرد میری طرف لپکتے رہتے ہیں، اسی وجہ سے میری دوشیزگی قائم ہے! کسی شاعر نے اس چیز کو ان ابیات میں پیش کیا ہے:

زاہدے شد بخواب در فکرے	دید دنیا بصورت بکرے
گفت زاہد کہ تو بزینت و فر	بکرہ چونی بکثرت شوہر؟
گفت دنیا کہ باتو گویم راست	کہ مرا ہر کہ مرد بود نخواست
آنکہ نامرد بود خواست مرا	ایں بکارت ازاں بجاست مرا

آخر میں عمر خیام کا عقل سے جو مکالمہ ہوا ہے وہ دلچسپ ہے، اور اس سلسلے کے بعض حقائق کا انکشاف کرتا ہے،

دوش باعقل در سخن بودم	کشف شد بر دلم مسائلے چند
گفتم اے مایۂ ہمہ دانش	دارم الحق بتو سوالے چند
چیست ایں زندگانیِ دنیا	گفت خوابیست یا خیالے چند
گفتم از وے چہ حاصل است بگو	گفت درد سر و وبالے چند
گفتم ایں نفس کے شود رامم	گفت چوں یافت گوشمالے چند
گفتم اہل ستم چہ طائفہ اند	گفت گرگ و سگ و شغالے چند
گفتم ایں بحث اہل دنیا چیست؟	گفت بیہودہ قیل و قالے چند
گفتم اہلِ زمانہ در چہ فن اند؟	گفت در بند جمع مالے چند

گفتم چیست کہ خدائی؟ گفت　　شاعتے عیش وغصہ سالے چند

گفتم او را امثال دنیا چیست؟　　گفت زالے کشیدہ خالے چند

گفتمش چیست گفتہ ہائے خیام　　گفت پندست حب حالے چند

تصفیۂ قلب کے لیے ان حقایق و دقائق پر غور کرنا ضروری ہے جن کا اوپر ذکر ہوا، صوفیۂ کرام کے عمدہ مقامات میں سے ترک دنیا کا اسی معنی میں سبق ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا، صوفیہ نے نہایت خوبی سے ہماری توجہ حق تعالیٰ کی اس نصیحت کی طرف مبذول کی ہے کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ　　لوگو بیشک خدا کا وعدہ سچا ہے، سو تم کو

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا　　نہ بہکائے دنیا کی زندگی اور نہ دھوکا دے

(لقمان، آیت ۳۳)

وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ　　تم کو اللہ کے نام سے وہ دغاباز (شیطان)

دنیا مطلب تا ہمہ دینت باشد!　　دنیا طلبی نہ آں نہ انیت باشد!

جو شخص دنیا اور اس کے ساز و سامان کو شیطان (الغرور) کے راہ کا آلہ بناتا ہے اور اپنا تمام وقت نفس امارہ کی لذتوں کے حصول میں صرف کرتا ہے، وہ ایک اندھا جاہل ہے جس کو دوسرے عالم کی خبر نہیں، اور اسی جنس کے اندھوں کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے:

يعلمون ظاهراً من الحيوة　　یہ لوگ حیات دنیا کے ظاہر کو جانتے

الدنيا وهم عن الآخرة　　ہیں اور آخرت سے غافل ہیں،

هم غافلون

حق بات صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ نے اس دنیا کو باطل اور بے معنی نہیں پیدا کیا، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران) کائنات کا یہ عظیم الشان کارخانہ بیکار نہیں جس کا کوئی مقصد نہ ہو، یقیناً ان عجیب و غریب حکیمانہ انتظامات کا سلسلہ کسی عظیم و جلیل نتیجہ پر مبنی ہونا چاہیے

اور وہ آخرت ہے جو فی الحقیقت دنیا کی موجودہ زندگی کا آخری نتیجہ ہے،

یہ ساری عظیم الشان کائنات سموات والارض انسان ہی کے لیے پیدا کی گئی ہے، اور وہ انسان کے تابع بنائی گئی ہے، جیسا کہ قرآن کریم اعلان کرتا ہے،

هُوَ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ　　یعنی حق تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکم سے جو کچھ کہ

وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا　　آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے انسان کی

(جاثیہ)　　خدمت گزاری میں لگا دیا ہے

ظاہر ہے کہ اگر انسان اس دنیا اور کائنات کی چیزوں کو استعمال نہ کرے اور ان سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں کو آباد کرے تو اس دنیا کو پیدا کرنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور وہ محض باطل بن کر رہ جاتی ہے، اسی لیے اسلام رہبانیت نہیں سکھلاتا، قرآن کریم میں رہبانیت پر نکیر وارد ہوئی ہے:

رهبانية ابتدعوها ما كتبناها　　رہبانیت کو انھوں نے ایجاد کیا ہے ہم نے

عليهم (الحديد)　　اس کی تعلیم نہیں دی ہے۔

یہ بات بھی اتنی واضح ہے کہ گویا دنیا کو انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے لیکن انسان کو دنیا کے لیے نہیں پیدا کیا گیا کہ اس میں غرق ہو کر مر کھپ جائے، بلکہ وہ کسی اور اعلیٰ مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے، قرآن نے اس اعلیٰ مقصد کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا　　ہم نے جن و انس کو نہیں پیدا کیا، مگر

لِيَعْبُدُوْنِ　　اس لیے کہ عبادت کریں۔

اور حدیث میں اسی جز کو یوں ادا کیا گیا ہے:

الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَأَنْتُمْ　　دنیا تمھارے لیے پیدا کی گئی ہے اور

خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ   تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے۔

لہذا قرآن کریم کی رو سے دنیا کا ترک کرنا، اس سے بھاگنا یا رہبانیت اختیار کرنا قطعاً درست نہیں، بلکہ دنیا انسان کے لیے ہے اور انسان خدا اور آخرت کے لیے، یعنی خدا کے احکام و مرضیات کے مطابق دنیا کو استعمال کرنا تاکہ دوسری زندگی یا آخرت جس کے لیے ہم پیدا کیے گئے ہیں، اس کی نجات و کامیابی حاصل ہو! خلاصہ یہ کہ مسلمان کا کام نہ 'تارک الدنیا' بننا ہے اور نہ عاشق دنیا، وہ دنیادار ہے لیکن دنیا پرست ہرگز نہیں!

تصفیۂ قلب کے معنی اس وضاحت کی روشنی میں یہ قرار دیے جا سکتے ہیں کہ انسان اپنی تمام خواہشوں اور تمام طاقتوں اور دنیا کی تمام چیزوں پر تصرفات کو حق تعالیٰ کے احکام و مرضیات اور ان کی محبت کے تابع کر دے، تصفیۂ قلب کے لیے اس امر کی اجازت نہیں کہ وہ دنیا اور اسکے سارے تعلقات کو ترک کر دے، نہ اس کی اجازت ہے کہ اصولاً نکاح اور اہل و عیال ترک کر دے، نہ اس کی اجازت ہے کہ اپنے جسمانی و ذہنی قوتوں کو کمزور و فنا کر دے، بلکہ تصفیۂ قلب کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے تمام قوائے جسمانی و ذہنی کو تمام تر حق تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی کے ماتحت کر دے، یعنی دنیا کی چیزوں کو جس حد تک اور جس طریقہ سے استعمال کرنے کا حق تعالیٰ نے حکم دیا ہے استعمال کرے اور اپنی قوتوں اور خواہشوں کو بھی احکام الٰہی کے مطابق کام میں لائے، یعنی اہل و عیال کے تعلقات، ملازمت و کسب معاش، تجارت و صنعت و حرفت میں پڑ کر بھی ان حدود کو قائم و برقرار رکھے جو ان چیزوں کے متعلق مرضیات الٰہیہ نے قائم کیے ہیں، اور ان کا سرانجام صرف رضائے حق کے لیے ہو، اور حق تعالیٰ کے سوا کوئی چیز مطلوب و محبوب نہ ہو!

قرآن کی تعلیم نہ شکست خوردہ ذہنیت (Defeatism) پیدا کرتی ہے، نہ جمود و خمود (quietism)، ایک طرف یہ دنیا پرستی (Cecularism) سے روکتی ہے تو دوسری

طرف ترک دنیا و رہبانیت سے منع کرتی ہے! ایک طرف وہ دنیا کی محبت اور مالایعنی کے اشتغال سے ہمیں روکتی ہے، اور دوسری طرف عبادات میں تشدد اختیار کرنے سے بھی منع کرتی ہے! ابن مسعودؓ سے روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

هلك المتنطعون، هلك المتنطعون، هلك المتنطعون (رواه مسلم)

یعنی تشدد کرنے والے ہلاک ہو گئے، تشدد کرنے والے ہلاک ہو گئے، تشدد کرنے والے ہلاک ہو گئے۔

کسی موقع پر آپ نے کیا خوب ارشاد فرمایا ہے:

ان الدين يسر ولن يشاد الدين الا غلبه فسددوا وقاربوا وابشروا واستعينوا بالغدوة والروحة وشئ من الدلجة (رواه البخاری) وفی رواية: سددوا وقاربوا واغدوا وروحوا وشئ من الدلجة القصد القصد تبلغوا

یعنی دین (یعنی دین کے احکام) آسان ہیں اور جو شخص دین میں تشدد کرتا ہو وہ مغلوب ہو جاتا ہے، صراط مستقیم کو مضبوط پکڑو اور میانہ روی اختیار کرو اور بشارت حاصل کرو اور اول دن کے اور آخر دن کے اور پچھلی رات میں عبادت کرنے پر اعانت طلب کرو! (اسکی ایک روایت میں یوں آیا ہے) صراط مستقیم کو مضبوط پکڑو اور میانہ روی اختیار کرو اول دن کے اور آخر دن کے اور پچھلی رات میں عبادت کرو، میانہ روی اختیار کرو تو مقصد کو پہنچ جاؤ گے!

حدیث میں غدوہ (پہلے پہر کا چلنا) روحہ (پچھلے پہر کا چلنا) دلجہ (پچھلی رات) استعارے

اور تمثیل ہیں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کی عبادت اپنے نشاط و آرام اور دل کی فراغت کے وقت تم اس کی امداد و اعانت طلب کیا کرو تاکہ عبادت میں لذت حاصل ہو اور ماندگی نہ ہو اور اپنے مقصد کو پہنچ جاؤ، جس طرح دانا مسافر ان ہی وقتوں میں چلتا ہے، اور اپنے آپ کو اور اپنی سواری کو دوسرے وقتوں میں آرام دیتا ہے، اس طرح بلا رنج و تعب مقصد تک پہنچ جاتا ہے!

"الدین یسر" فرما کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واضح فرما دیا کہ جس شریعت پر عمل کا خدا نے حکم دیا ہے، اس کے احکام آسانی اور سہولت پر مبنی ہیں اور "لن یشاد الدین" سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ جو شخص دین کے کام میں اپنے نفس پر غیر ضروری امور میں تشدد کرتا ہے، جیسا کہ راہب کیا کرتے ہیں، تو وہ بالآخر ان کے ادا کرنے سے عاجز اور لاچار ہو جائے گا اور چھوڑ بیٹھے گا!

اسی قصد یا میانہ روی کے اصول کی وضاحت میں یہ فرمایا گیا:

ان لربک علیک حقاً و ان نفسک علیک حقا و لاھلک علیک حقا فاعط کل ذی حق حقہ[1]

یعنی تیرے رب کا تجھ پر حق ہے، تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے، اور تیری عورت کا تجھ پر حق ہے، تو ہر ایک حقدار کا حق ادا کر،

نفس کے حق سے مراد وہ چیز ہے جو عبادت پر اعانت کا سبب بنے، حق نفس و حظِ نفس میں فرق ضروری ہے، یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد و نقیض ہیں، نفس کا حق ادا کرنا مامور بہ ہے اور ہوائے نفس کا اتباع منہی عنہ ہے، تصفیۂ قلب کے مجاہدہ کے سلسلہ میں اس فرق کا پیش نظر رہنا ضروری ہے، ورنہ انسان ہوائے نفس میں مبتلا ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ صرف حق نفس ادا کر رہا ہے اور ہلاک ہو جاتا ہے،

نفس اور ہوائے نفس کی مخالفت کی غرض موافقت حق ہے، جیسا کہ ارشاد نبویؐ ہے:

---

[1] رواہ البخاری،

حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ

یعنی یہاں تک کہ اس کی خواہش اس کے تابع ہو جائے جس کو میں لایا ہوں،

اگر نفس بغیر کسی مجاہدہ کے حق کے ساتھ موافقت کرتا ہے اور ہوی تابع شرع ہو جاتی ہے، تو یہ بہت ہی کامل چیز ہے، حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے فرمایا تھا، اذا وفق النفس الحق فذلک شھد بالزبد یعنی اگر ہوائے نفس موافق حق ہو جائے تو یہ حالت شہد اور مسکہ سے مشابہت رکھتی ہے جو آپس میں مل جاتے ہیں، مثلاً اگر کسی لڑکے کے والدین اس کو حلوا کھانے کا حکم دیتے ہیں اور نان جویں کھانے سے منع کرتے ہیں تو اس کے لیے حلوا کھانا اور لذت اٹھانا روٹی کھانے اور ترک لذت سے زیادہ فائدہ بخش ہے، مشائخ شاذلیہ کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ طالب یا مرید کی ہدایت و تربیت اس کی طبیعت سے موافقت اور اس کی آسانی و راحت کا خیال رکھ کر کرتے ہیں، جس حالت میں وہ ہو اس سے فوراً باہر نکال لانے کی کوشش نہیں کرتے، اور نہ مجاہدہ اور ریاضت میں تشدد کرتے ہیں، اس کو ایسے اشغال تبلاتے ہیں جو اس کے مزاج کے موافق اور طبیعت کے مناسب ہوتے ہیں، اس طرح تدریج و آسانی اور راحت و آرام کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچا دیتے ہیں، ان اکابر کا ارشاد ہے کہ جس کا سلوک الی اللہ اس کی طبیعت و مشاکلہ کے موافق ہوتا ہے اس کے لیے وصول الی اللہ بھی سہل ہوتا ہے، اور جو شخص حرکت طبعی کے خلاف چلتا ہے، حیز طبعی سے اس کا بعد جتنا زیادہ ہوگا اس کی سیر الی اللہ اتنی ہی سست ہوگی، اور وصول میں اتنی ہی دیر ہوگی، چنانچہ شیخ ابن عطا سکندری فرمایا کرتے تھے

لا تاخذ من الاذکار الا مایعینک القوی النفسانیۃ علیہ لحبہ

یعنی اذکار میں صرف ان ہی کو اختیار کرو جو تمھاری نفسانی قوتوں کو حق کی محبت حاصل کرنے میں مدد کرتے ہیں۔

"لن یشاد الدین الا غلبہ" کی تنبیہ کو پیش نظر رکھ کر کہا گیا ہے، اور اسی ہدایت کے پیش نظر شیخ ابوالحسن شاذلیؒ نے جو سلسلۂ شاذلیہ کے امام ہیں، فرمایا ہے کہ الشیخ من دلک علی راحتک یعنی شیخ وہ ہے جو تیری راحت کی طرف رہنمائی کرے، اور یہ پیروی ہے اس ارشاد نبویؐ کی ان الدین یسر اور اس حدیث کی: یسروا ولا تعسروا "نرمی اختیار کرو سختی نہ برتو۔" آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے دنیا کی طرف تیری رہنمائی کی، اس نے تیرے حق میں خیانت کی، اور جس نے تجھے سخت مجاہدہ اور ریاضت کی تاکید کی اس نے تجھے رنج وتعب میں مبتلا کیا اور جس نے تجھے خدا کا راستہ بتلایا وہ درحقیقت تیرا ناصح اور خیرخواہ ہے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیر یا مرشد وہی شخص ہے جس کے ہاتھ میں وہ اعجاز ہو کہ دنیا والوں کے نفوس کو جو حقیقت کو لہو ولعب سمجھتے اور ہزل اور بیہودگی کو جد وسعی سے ملا دے، اپنی قوت تصرف سے توڑ کر رکھ دے اور اپنے قہر اعجاز سے ان پر نفس کی دنیا تنگ کر دے، یہاں تک کہ ان پر زمین باوجود اپنی کشادگی کے تنگ ہو جائے، اور وہ سمجھ جائیں کہ اللہ کے سوا انھیں کہیں پناہ نہ ملے گی:

حَتّٰٓی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْھِمُ الْاَرْضُ — یہاں تک کہ جب تنگ ہو گئی ان پر زمین باوجود
بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَیْھِمْ — کشادہ ہونے کے اور تنگ ہوگئیں ان پر ان کی
اَنْفُسُھُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ — جانیں اور سمجھ گئے کہ پناہ نہیں اللہ سے
مِنَ اللّٰہِ اِلَّآ اِلَیْہِ (توبہ-۱۱۸) — مگر اسی کی طرف،

روئے زمیں ز تیرگی منکران عشق
محتاج شست وشوی دگر شد کجاست نوحؑ!

اہل بصیرت کے ہاں یہ مسلم ہے کہ ریاضت ومجاہدہ شیخ کامل کی تعلیم ہی سے مفید ہوتا ہے، عادت اللہ یہی نظر آتی ہے کہ معنوی نجاستوں سے تطہیر اور نماز اور تمام عبادتوں میں حضور وخشوع

اس وقت تک میسر نہیں ہوتا جب تک شیخ کامل کی ہدایت میں راہ سلوک طے نہیں کی جاتی، وہ شیخ کامل جو علاج نفسانی اور حکمت معالمات سے علماً ذوقاً وتجربۃً واقف ہو، اگر اخلاق ذمیمہ کا مریض فن اخلاق کی کتابیں پڑھتا اور ان کو یاد کر لیتا ہے، تو نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ شیخ کی تربیت سے مستغنی ہو گیا، جس طرح امراض جسمانی کا مریض طب کی کتابیں پڑھ کر اپنا علاج نہیں کر سکتا، چنانچہ شعرانی نے انوار قدسیہ میں لکھا ہے کہ اہل طریق کا اس امر پر اتفاق ہے کہ راہ سلوک کے طے کرنے کے لیے شیخ کی رہنمائی ضروری اور واجب ہے، تاکہ انسان سے وہ صفات دور ہوں جو حضرت رحمٰن کی بارگاہ میں رسائی سے مانع ہوتے ہیں، اس کی نماز کی تصحیح ہو جائے اور عبادات میں حضور وخشوع پیدا ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ امراض باطن کا علاج واجب ہے، کیونکہ قرآن کی آیات اور نبی کریمؐ کی احادیث ان امراض باطن کی تحریم اور ان پر عذاب کی وعیدوں سے بھری پڑی ہیں، اسلیے اگر ان صفات رذیلہ سے نجات حاصل کرنے اور تزکیۂ نفس وتصفیۂ قلب کے لیے شیخ کامل کی پیروی نہ کی جائے، تو خدا اور رسول کی نافرمانی لازم آتی ہے، اگر بغیر شیخ کے خود اپنی ذاتی کوشش سے، وہ ان صفات کو دور کرنا چاہے گا تو وہ کامیاب نہ ہوگا، اس کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہوگی جو طب کی کتابوں کو تو حفظ کر لیتا ہے لیکن مرض کا صحیح اور موزوں نسخہ تجویز نہیں کر سکتا اور نہ مریض کے خاص حالات کے لحاظ سے اس کے مرض کو پہچان کر علاج کر سکتا ہے، ہمیشہ سے سنۃ اللہ یہی رہی ہے کہ زندہ سے زندہ کو فیض پہنچتا ہے، اور چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا! اسی لیے کہا گیا ہے:

اصحبوا مع اللہ فان لم تستطیعوا — اللہ کے ساتھ صحبت رکھو، اگر اللہ کے ساتھ
ان تصحبوا مع اللہ فاصحبوا مع — صحبت اختیار کرنے پر قادر نہ ہو تو پھر اس کی
من یصحب مع اللہ حتی یوصلکم — صحبت اختیار کرو جو اللہ کی صحبت میں رہتا ہے

الی اللہ عزوجل — یہاں تک کہ تم بھی اللہ عزوجل کی صحبت میں پہنچ جاؤ،

اسی چیز کو مولانائے رومؒ نے مثال کے ذریعہ یوں سمجھایا تھا۔

ہیچ چیزے خود بخود پیدا نہ شد — ہیچ آہن خود بخود تیغے نہ شد

مولوی ہرگز نہ شد مولائے رومؒ — تا غلام شمس تبریزی نہ شد

اور خواجہ خواجگان نقشبندؒ نے نصیحت فرمائی تھی:

نیست ممکن در رہ عشق اے پسر — راہ بردن بے دلیل راہ بر

اس لیے ضروری ہے کہ آئینہ دل کو ایسے صاحب جمال کے روبرو رکھا جائے، جس کا دل زندہ اور مشاہدۂ الٰہی کے شرف سے مشرف ہو چکا ہے، اسی صورت میں اس صاحب جمال کے دل کے آئینہ پر جو کچھ ہوتا ہے، ہمارے آئینۂ دل میں منطبع ہو جاتا ہے، اور راہ فیض کشادہ ہو جاتی ہے۔ اور ہم پہنچ اٹھتے ہیں،

سالہا درپے مقصود بجہاں گردیدیم

دوست در خانہ و ما گرد جہاں گردیدیم

تصفیۂ قلب ہی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ دل ہی میں تو ہیں اور ہم ان سے غافل ہیں، وہ ہر آن حاضر ہیں اور ہم ان سے غائب:

آں نافہ را کہ جستی ہم با تو در گلیم است

تو از سیہ گلیمی بوئے ازاں نہ دیدی

کہا جاتا ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اپنی مناجات میں حق تعالیٰ سے پوچھا کہ حق تعالیٰ میں تجھے کہاں تلاش کروں؟ فرمایا: انا عند منکسرۃ قلوبھم لاجلی " یعنی جو قلب غرور و خود بینی سے شفا پاکر اور تن پروری و شہوات نفس سے رہائی پاکر حق تعالیٰ ہی کے لیے ٹوٹ چکے ہیں ان کے پاس:

چیزے کہ تو جویاں نشان اوی

با تست ہمی تو جائے دیگر جوی!

جب قلب کو معاصی سے مجوب اور غیر حق سے مملو کر دیا جاتا ہے تو پھر یہ چشمۂ آب حیات مٹی سے بھر جاتا ہے اور خشک ہو جاتا ہے:

آں چشمہ کہ زاں خضر خورد آب حیات

با تست ولیکن بگل انباشتہ!

اہل بصیرت روح اللہ ارواحہم نے تصفیۂ قلب کے لیے ذکر الٰہی کو سب سے زیادہ موثر طریقہ قرار دیا ہے۔ تمام عبادات کا مقصود ذکر الٰہی ہے، اور ذکر دوام ہی سے حق تعالیٰ سے انس و محبت پیدا ہوتی ہے، اور دنیا کی محبت سے قلب کا تخلیہ ہو جاتا ہے۔ اصل مسلمانی کلمہ لا الہ الا اللہ ہے، اور یہ عین ذکر ہے۔ اور دوسری تمام عبادتیں اسی ذکر کی تاکید ہیں، نماز کی روح کیا ہے؟ یہی ذکر! اسی کا بہ سبیل ہیبت و تعظیم قلب میں تازہ کرنا! روزوں سے مقصود شہوتوں کا توڑنا ہے، کیونکہ جب دل شہوتوں کی نجاست سے پاک ہو جاتا ہے تو ذکر کی قرارگاہ بن جاتا ہے، حج کا مقصود رب البیت کا ذکر اور اس کی لقا کا شوق ہے، ترک دنیا و ترک شہوات ذکر ہی کی فراغت حاصل کرنے کی خاطر ہیں، امر و نہی کا مقصود بھی ذکر ہی ہے، اور ذکر کی حقیقت یہ ہے کہ قلب تمام چیزوں کی محبت سے خالی ہو کر اور تمام سے ٹوٹ کر حق تعالیٰ کی طرف راغب ہو جائے اور بفحوائے تبتل الیہ تبتیلا حق تعالیٰ کی محبت اس قدر غالب ہو جائے کہ کسی دوسری چیز کی طرف التفات نہ کرے، اور ہر چیز سے قلبی تعلق منقطع ہو جائے اور حق کے سوا کوئی معبود، محبوب و مطلوب باقی رہے،

جب سالک کسی شیخ کامل سے ذکر کی تلقین حاصل کر کے فرائض و سنن کی ادائی کے بعد ہمہ تن ذکر میں مشغول ہو جاتا ہے، نوافل، اذکار و تسبیحات کو چھوڑ کر کلمہ لا الہ الا اللہ پر

اقتصار کرتا ہے، روز و شب بلکہ ہر ساعت و ہر لحظہ اسی ذکر میں منہمک ہو جاتا ہے، اس کے سوا ساری چیزوں کو بلا و محنت جانتا ہے، ساری کائنات کے فکر و اندیشہ، فکر سے فارغ ہو جاتا ہے اور ہر حالت اور ہر وقت اسی ذکر سے تعلق رکھتا ہے، تو اس کے قلب سے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور یہ حجابات قلب پر صور کونیہ کے انتقاش کا نتیجہ ہیں، ذاکر لا الٰہ کی تیغ بے نیام سے محدثات کون کی نفی کرتا ہے، تمام خواطر و ہواجس کی نفی کرتا ہے اور الا اللہ سے وجود قدیم حضرت حق جل ذکرہ کو بنظر لقا مقصود و مطلوب مشاہدہ کرتا ہے، ہر اس چیز کی جس سے دل کو لگایا ہے نفی کرتا ہے، اور اسکو باطل قرار دیتا ہے، اور اس کی جگہ کلمۂ اثبات سے محبت حق کو قائم کرتا ہے، یہاں تک کہ تدریجی طور پر قلب اپنی تمام محبوب و مالوف چیزوں سے فارغ و خالی ہو جاتا ہے، اور حقیقت توحید ذاکر کے قلب میں راسخ ہو جاتی ہے، اس کی چشم بصیرت کھل جاتی ہے، اب اس کے لیے عقل و توحید میں کوئی تناقض باقی نہیں رہتا، اور اس وقت حقیقت ذکر لازم قلب ہو جاتی ہے، حقیقت ذکر اور جوہر قلب ایک ہو جاتے ہیں! اسی حالت کو شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے تجرید قلب سے تعبیر کیا ہے، غیر حق کا کوئی خیال و اندیشہ قلب میں باقی نہیں رہتا، ذاکر ذکر میں اور ذکر مذکور میں فنا ہو جاتا ہے اور قلب زحمت غیر سے فارغ ہو جاتا ہے، اور بمصداق "لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المومن" میری زمین اور میرے آسمان میں میری سمائی نہیں لیکن میرے مومن بندے کے قلب میں میری سمائی ہے تو جمال سلطان الا اللہ تجلی کرتا ہے اور خاصیت کل شی ھالک الا وجہہ آشکارا ہو جاتی ہے۔

یہ ہے تصفیۂ قلب اور اس کا انجام، صوفیہ اسی حالت کو فنا یا نیستی سے یاد کرتے ہیں اور سیر الی اللہ کی نہایت قرار دیتے ہیں۔

ہست معراج فلک این نیستی — عاشقاں را مذہب و دیں نیستی

ہیچ کس را تا نگردد او فنا — نیست رہ در بارگاہ کبریا (رومی)

یہ "راہ رفتن" ہے "راہ گفتن" نہیں، اس کے بیان کرنے میں کوئی فائدہ نہیں! اہل اللہ نے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی کہا یا لکھا ہے وہ طالب حق کی ترغیب و تشویق کے لیے ہے!

اس پاک و مصفی قلب کے متعلق صاحب روح الارواح نے حق تعالیٰ کے خطاب کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے؛

"حق تعالیٰ با قوالب سخن از ربوبیت گفت و با قلوب حدیث محبت کرد کہ اے قوالب من خدایم، واے قلوب من دوستم . . . اے قوالب در تعب باشید کہ ربوبیت از عبودیت تقاضا می کند واے قلوب در طرب باشید شما در حقایق مجاہدات واے قلوب شما در حقایق مشاہدات! اے قوالب شما طاعت رہا مکنید واے قلوب شما طاعت تنہا مکنید! اے قوالب بر رنج باشید واے قلوب بر سر گنج باشید!"[1]

چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اظہار سخاوت یا طلب آخرت کے سوا کسی اور سبب سے دنیا ترک کرتا ہے، اس کو زاہد نہیں کہا جا سکتا، بلکہ دنیا کو آخرت کے لیے بیچنا بھی اہل کرامت کے نزدیک زہد ضعیف ہے، عارف وہ ہے جو آخرت کو بھی اس طرح اپنی نظروں کے سامنے سے اٹھا دیتا ہے جس طرح کہ دنیا کو، اور دنیا و آخرت سے سوا حق تعالیٰ کے اس کا کوئی مقصود و مطلوب نہیں ہوتا، اور حق تعالیٰ کے سوا ہر شے اس کی نظر میں حقیر ہو جاتی ہے، یہ ہے "زہد عارفاں" ہو سکتا ہے کہ یہ عارف ایسا ہو کہ مال سے بھاگتا نہ ہو بلکہ مال حاصل کرتا ہے اور اس کو اپنے محل و مقام پر صرف کرتا ہے، اور مستحقین کو دیتا ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ جن کے قبضہ میں روے زمین کی دولت تھی، اور ان کا قلب اس سے بالکل فارغ و خالی تھا، بلکہ حضرت

[1] منقول از شمائل اتقیا از شیخ رکن الدین دبیر کاشانی خلد آبادیؒ، مطبوعہ اشرف پریس حیدر آباد دکن ۱۳۴۷ھ ص ۲۶۳

عائشہ صدیقہؓ کی طرح کہ ایک لاکھ درہم ایک ہی روز میں خرچ کر دیتی ہیں، اور اپنے لیے ایک پیسہ کا گوشت بھی نہیں خرید کرتیں، ہو سکتا ہے کہ عارف کے ہاتھ میں ایک لاکھ درہم ہوں اور وہ زاہد ہو، اور دوسرے شخص کے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہیں ہوتا اور وہ زاہد نہ ہو، کمال یہ ہے کہ نہ دل دنیا سے ہوتا اور نہ اس کی طلب میں مشغول ہوتا ہے اور نہ اس سے بھاگنے میں مصروف، یہ اس وجہ سے کہ وہ دنیا کو نہ دوست رکھتا ہے نہ دشمن، جو شخص کسی شی کو دشمن سمجھتا ہے وہ اس میں مشغول ضرور رہتا ہے بالکل اسی شخص کی طرح جو اس کو دوست سمجھتا ہے، کمال تو یہ ہے کہ قلب حق تعالیٰ کے سوا ہر شے سے فارغ ہو جائے، عبد اللہ بن مبارک کو کسی نے "اے زاہد" کے خطاب سے مخاطب کیا، آپ نے فرمایا کہ زاہد عمر بن عبد العزیزؒ ہیں کہ مال دنیا ان کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس پر قادر بھی ہیں تاہم زاہد ہیں، میرے ہاں تو کچھ نہیں، پھر میرا زہد کیسے درست ہو سکتا ہے۔

الزهد وهو ترک ما تشغلة عن الله تعالیٰ

ملکۂ نور جہاں کے سلسلۂ مادری و پدری کے اہم افراد

از ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

(۳)

خواجہ خواجگی = خواجہ مذکور خواجہ شریف ہجری کا بھائی اور نور جہاں کا دادا تھا، طبعاً نہایت شگفتہ طبع، بذلہ سنج اور لطیفہ گو تھا، اس کی بذلہ سنجی کے بہت سے واقعات زبان زد خاص و عام تھے، کبھی کبھی شعر بھی کہتا تھا، ہفت اقلیم میں اس کے حسب ذیل ابیات مندرج ہیں:

غصہ مستولی و غم بجید و ہجراں دراز　　　ہمہ می بینی و پرسی سبب مردن چیست

نہ آں بہ مہر را با خویش ہمدم میتوانم کرد　　　نہ از دل آرزوی دیدنش کم میتوانم کرد

نمیخواہم کہ مردم بشنوند آوارۂ حسنش　　　وگرنہ آنچہ مجنوں کرد من ہم میتوانم کرد

یہ رباعی محمد خاں شرف الدین اغلی (تکلو) کے مستوفی اسد بیگ کے لیے نظم کی تھی شرف الدین اغلی خراسان کا امیر الامرا تھا جس سے اس کا بھائی شریف ہجری متوسل تھا۔

ای آنکہ زد [...تر] شدہ جمع تو گناہ　　　اعمال تو فرو فرد حشو است و تباہ

از دست تو خوں دیدہ بر دری قلم　　　وز پہلوی تو دل دوات است سیاہ

یہ ابیات ایک جوان صورت خاں نامی کے لیے نظم ہوئے تھے،

صورت خانا خلق پریشاں تو اند　　　گریاں از برای لعل خنداں تو اند

لہ ہفت اقلیم ورق ۲۰۰ ب

صورتہای کہ پیش خود می بینی صاحب نظران اند کہ حیران تو اند

خواجہ شاپور: اس کا پورا نام خواجہ شرف الدین شاپور تھا[1]، والہ[2] اور مبتلا نے اس کا نام ارجاسپ بتایا ہے، جو مشتبہ ہے، غالباً انھیں امیدی کے نام سے التباس ہوگیا ہے، وہ خواجہ خواجگی کا لڑکا، شریف ہجری کا بھتیجا اور مرزا غیاث کا چچازاد بھائی تھا، نصیرآبادی[3] نے اس کو امیدی کا بھانجا لکھا ہے جو غلط ہے، اس کا باپ امیدی کا بھتیجا تھا، نصیرآبادی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا جعفر اس کا بھانجا تھا، مگر اس قول کی تصدیق کسی اور بیان سے نہیں ہوتی، البتہ یہ واقعہ ہے کہ مرزا کی حقیقی پھوپھی مرزا غیاث سے منسوب تھی، یعنی مرزا جعفر نور جہاں کی ماں کا حقیقی بھتیجا اور نور جہاں کا ماموں زاد بھائی تھا، نصیرآبادی کی روایت کی صحت میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مرزا غیاث کی بہن جعفر کے والد بدیع الزماں کو بیاہی تھی، جو کوئی مستبعد بات نہیں لیکن چونکہ نصیرآبادی نے بدیع الزماں کی بہن کی نسبت کا ذکر نہیں کیا ہے، اس لیے یہ قرین قیاس ہے کہ نصیرآبادی کو بالکل الٹی خبر ملی ہو، نیز چونکہ امیدی اور شاپور کے رشتہ میں بھی اسی مصنف سے تسامح ہوا ہے، اس لیے ہم اس رشتہ کو بھی مشکوک قرار دینے میں حق بجانب ہوں گے،

خواجہ شاپور کی ولادت کا سال معلوم نہیں، البتہ عرفات کے مصنف[4] نے ۹۹۶ھ کے قریب اس کی عمر تقریباً ۲۰ سال بتائی ہے، اس لیے اس کی پیدائش کی تاریخ ۹۷۵ھ کے قریب ہوگی، خواجہ نے جوانی میں سارے علوم کی تکمیل کر لی تھی، چنانچہ ۹۹۶ھ میں خلاصۃ الاشعار[5] کا مصنف اس کے متعلق لکھتا ہے:

---

[1] خلاصۃ الاشعار بحوالہ اسپرنگر یعنی فہرست اودھ ص ۴۴ نمبر ۶، لیکن میرے سامنے اسکے دو نسخے ہیں، نسخہ قدیم میں تو اسکا تذکرہ شامل نہیں، نسخہ جدید میں شامل ہے، مگر اس میں عنوان محذوف ہے [2] ملاحظہ ہو مینخانہ ص ۳۷۹ حاشیہ نمبر ۲ نیز ملاحظہ ہو مینخانہ ص ۳۰۲ سر اجمان اسکا نام شاپور دیا ہے [3] تذکرہ نصیرآبادی (تہران اڈیشن) ص ۲۳۷، [4] عرفات عاشقین بحوالہ فہرست بانکی پور ج ۲ ص ۴۱ [5] ورق ۱۲۱۷

در عنفوان اول جوانی در بیان ایام زندگانی بعضی فنون علم فصاحت و بلاغت نمودہ

شاپور نے ابتدائے سن شعور سے شاعری کے میدان میں قدم رکھ دیا تھا، تقی کاشی[1] نے اسکے حسن اخلاق کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے، اور لکھا ہے کہ جتنے فضائل انسانی ہیں ان میں وہ یکتا تھا:"

"در طریق شعر و غزل معانی بلند و مضامین تازہ و دلپسند بطرز مولانا شہیدی قمی نظر فرمودہ، اگرچہ بعضی از شعرا میگوید کہ مشار الیہ دریں زودی بشاعری قدم نہادہ در طبعش خامی ہست اما باعتقاد راقم ایں حروف اشعارش خوب و سخنانش مرغوبست و سلیقہ اش بغرابت و تازگی منسوب دریں اوقات کہ سنہ ست و تسعین و تسع مایہ ہجریہ است دیوان بابا فغانی را بابلیغ وجہی جواب میفرماید۔"

یہ اس شاعر کی تعریف ہے جس نے زندگی کے بیسویں مرحلے میں ابھی قدم رکھا تھا، اس بیان کی تصدیق امین احمد[2] کے قول سے بھی ہوتی ہے جس نے ہفت اقلیم میں اس شاعر کا تذکرہ اس وقت کیا ہے جب وہ ۲۵ سال کے قریب ہوگا۔

"طبعی نقاد و ذہنی وقاد دارد و امروز در میدان فصاحت سواری چون او ہمگنان جولان نکردہ و دیگران بیان را در موکب نظم کسی را از ہمچنان وی بر روی مدعیان نشناختہ ویا ایں نسبت صاحب اخلاق حمیدہ و فہرست آثار محمودہ است۔"

شاپور نے اول فریبی[3] تخلص اختیار کیا، اور ہندوستان آنے کے بعد اسے ترک کر کے شاپور رکھا، ہندوستان کے آنے کی تاریخ ریو نے ۹۹۶ھ بتائی ہے جو ممکن ہے صحیح ہو، مگر اس سنہ میں

---

[1] ورق ۱۲۱۷، [2] ورق ۴۰۰-۴۰۱ [3] بعض جگہ قریبی (اسپرنگر ص ۴۴) اور قربی (فہرست بانکی پور ص ۴۱)، لیکن اصلاً فریبی ہے ملاحظہ ہو (اسپرنگر ص ۴۰۸) اور آئین اکبری (آئین قافیہ سنجان) دوسرے تذکروں میں بھی فریبی ہی ہے۔

اس کا قیام ایران نہ صرف تقی کاشی کے مندرجۂ بالا قول سے ثابت ہے، بلکہ عرفات کے مولف کے بیان سے بھی اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، اس نے شاپور کو اول اول قزوین میں دیکھا تھا،[1] چونکہ صاحب عرفات ۹۹۵ھ[2] کے بعد شاہ عباس کی معیت میں قزوین میں تھا، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسی سنہ میں دونوں کی ملاقات قزوین میں ہوئی ہوگی، پھر ۹۹۶ھ میں اصفہان لوٹ گیا، صاحب عرفات یعنی تقی اصفہانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اصفہان میں وہ شاپور کے ساتھ دیوان سنائی کے مقابلے میں مصروف تھا، اس بار تقی کا قیام اصفہان میں بالکل نام کا تھا، کیونکہ ۹۹۶ھ کے آخر میں تقی شیراز میں موجود ملتا ہے، جہاں سے وہ پھر تین سال کے بعد ۱۰۰۹ھ تک اصفہان آتا ہے، اور اس بار تقریباً ڈیڑھ سال تک یہاں مقیم رہتا ہے، پھر ۱۰۰۳ھ سے ۱۰۰۴ھ تک اور آخر میں ۱۰۰۹ھ - ۱۰۱۳ھ تک یہاں رہتا ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اگر تقی اور شاپور کی ملاقات اول الذکر کے قیام اول سے مراد ہے تو وہ ۹۹۶ھ کی آخری تاریخوں میں ہوگی، اس حساب سے اگر شاپور کے عزم ہندوستان کو اسی سنہ میں قرار دیا جائے تو وہ اصفہان سے سیدھے ہندوستان آیا ہوگا۔

ہندستان میں شاپور کا قیام چند سال رہا، پھر وہ ایران واپس چلا گیا، فہرست بانکی پور میں[3] واپسی کی تاریخ ۱۰۰۲ھ دی ہے، ایران میں ایک مدت تک رہنے کے بعد پھر وہ عازم ہندستان ہوا، ریو نے اس مراجعت کی تاریخ ۱۰۱۹ھ لکھی ہے، بہرحال ہندوستان کے قیام کے دوران

[1] فہرست بانکی پور ج ۳ ص ۱۴ [2] ملاحظہ ہو میرا مضمون معارف نمبر ۱ ج ،، ص ۳۳-۳۶

[3] نصیرآبادی نے لکھا ہے کہ "موزونان بعضی توقع ہا ازو داشتند چون بفعل نیامد او را ہاجی رکیک کردند چنانچہ ملا طبقی قطعہ گفتہ این بیت از آں قطعہ است"۔ دیوان شفائی میں بھی ایک قطعہ ہے جو شاپور کی ہجو میں ہے اور جو شاپور کی واپسی پر نظم ہوا تھا،

میں اس کو اپنے خاص عزیز مرزا جعفر خان سے بڑی مدد ملی،[1] ایک دفعہ خان مذکور نے ایک طوسی شال شاپور کو مرحمت کی، اتفاق سے وہ کرم خوردہ تھی، اس لیے شاعر نے اسکی ہجو میں یہ رباعی لکھی[2]

این کہنہ نسیج عنکبوتی طوس است — یا عبرتی از جہان پُر افسوس است
پودش ہمہ پشم سگ اصحاب الکہف — تارش ہمہ تار ریش دقیانوس است

کہتے ہیں کہ اس رباعی کے باوجود مرزا جعفر کے اخلاص واعتقاد میں کمی نہیں ہوئی،

تعجب ہے کہ تذکروں میں شاپور اور اعتماد الدولہ کے تعلقات پر روشنی نہیں ڈالی گئی، اعتماد الدولہ کو دربار اکبری وجہانگیری میں جو اعزاز حاصل تھا،[3] اس کے پیش نظر شاپور کا اس سے کسی قسم کا ارتباط نہ ہونا حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے، واضح رہے کہ اعتماد الدولہ اس کا حقیقی چچازاد بھائی تھا، مگر شاپور نے شاہزادہ سلیم سے کافی استفاضہ کیا تھا،

شاپور پھر ہندوستان سے ایران واپس آگیا، میخانہ میں اس واپسی کی تاریخ ۱۰۲۵ھ[4] دی ہے، واپسی کے بعد وہ ۱۰۲۶ھ میں زیارت مکہ معظمہ کے لیے گیا، اور واپسی میں اپنے وطن تہران میں مقیم ہوا اور وہیں اس کا انتقال ہوا، انتقال کی تاریخ میں سخت اختلاف ہے، بوڈلینا[5] میں ۱۰۲۱ھ کے قریب بتاتے ہیں، ریو[6] نے ۱۰۳۰ھ اور سراج[7] نے ۱۰۴۸ھ لکھا ہے،

[1] ملاحظہ ہو میخانہ ص ۳۸۰-۳۸۱ [2] ایضاً [3] شاپور کی پہلی آمد کے موقع پر اعتماد الدولہ کو کوئی بڑا مرتبہ حاصل نہیں ہوا تھا، اکبری عہد کے چالیسویں سال یعنی ۱۰۰۳ھ میں وہ کابل کا دیوان نامزد ہوا، لیکن اسی سنہ میں شاپور ایران لوٹ آیا، لیکن اسکے دوبارہ ورود ہند کے وقت اعتماد الدولہ کو جو اعزاز حاصل تھا وہ محتاج بیان نہیں، اگرچہ علم وفضل میں مرزا جعفر کا مرتبہ بلند تر ہے، اور اسکے مربی سخن ہونے کے واقعات تذکروں میں زیادہ پائے جاتے ہیں، اس لیے مرزا جعفر کی طرف شاپور بھی زیادہ متوجہ ہوا ہوگا [4] ص ۳۸۱-۳۸۲ [5] فہرست ایتھے عمود ۶۸۰

[6] ریو: تتمہ ص ۲۰۴ [7] اسپرنگر ص ۱۵۰

شا پور کا دیوان مدون ہو چکا تھا، اور اس کے جستہ جستہ نسخے اب بھی موجود ہیں، اسپرنگر نے[1]
دو نسخوں کا ذکر کیا ہے، ایک ذہنی تخلص کے ساتھ اور دوسرا شاپور کے ساتھ[2]، اول الذکر میں غزلیں
اور رباعیاں ہیں، جو ۳۰۵ صفحات میں ہے، دوسرا ۷۰ صفحات اور غزلیات و رباعیات پر مشتمل ہے،
بانکی پور کا نسخہ[3] بھی ناقص الآخر ہے، اس میں صرف غزلیات ہیں، حالانکہ اوراق کی تعداد ۱۰۶ ہے[4]،
صحف ابراہیم[5] میں ہے کہ ناظم تبریزی نے ۱۰۲۶ھ میں شاپور کے ساتھ آخر الذکر کا دیوان بھی جمع
کیا تھا، اس نے خسرو شیریں کے متوازی ایک مثنوی لکھی تھی جو میخانہ[6] میں بہت رنگین و متین قرار دی گئی
ہے، نسخہ بادلی میں وہی داستان ہے، مگر یہ مثنوی بظاہر ناقص رہ گئی تھی (فہرست بانکی پور ج ۳ ص ۴۲)
ہفت اقلیم[7] میں اس مثنوی کے ۲۳ اشعار درج ہیں، مخزن الغرائب[8] میں بھی کچھ اشعار منقول ہیں۔
طاہر نصیرآبادی[9] نے چار ہزار اشعار کا دیوان دیکھا تھا، ہفت اقلیم[10] میں ایک قصیدہ امام رضا کی مدح میں
نقل ہوا ہے، میخانہ[11] میں بھی ایک دوسرا قصیدہ منقول ہے، بادلی کے نسخہ کے اجزا یہ ہیں:

---

[1] اسپرنگر ص ۴۴ [2] ایضاً ص ۵۶۴ [3] فہرست ج ۳ ص ۴۱-۴۲ [4] ایضاً [5] میخانہ (ص ۳۸۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی کشمیر میں کہی گئی تھی، جبکہ وہ آصف خاں سے متعلق تھا، نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنے ممدوح کے ساتھ کشمیر میں مقیم رہا، لیکن اگر ۱۰۰۳ھ میں شاپور کے ایران واپس آنے کی روایت صحیح ہو تو پھر اس کے قیام کشمیر کا معاملہ بھی بہت کم اہم ہو جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مآثر الامرا (ج ۱ ص ۱۰۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد اکبری کے ۳۹ ویں سال وہ کشمیر روانہ ہو گیا، وہاں اس نے اقطاع کی تقسیم کی، تین روز میں کشمیر سے لاہور آ گیا، یہ واقعہ ۱۰۰۲ھ میں ہوا ہوگا، اگر اس وقت شاپور اسکے ساتھ رہا ہوگا تو کشمیر کے قیام کی مدت محض برائے نام ہوگی، البتہ جعفر خاں ۱۰۰۵ھ سے ۱۰۰۷-۸ھ تک وہاں کا حاکم تھا، اس درمیان میں شاپور وہاں رہا ہوگا اور وہ مثنوی بھی لکھی گئی ہوگی، اس بیان کی صحت کے بعد شاپور کے ہندوستان آنے اور یہاں سے واپس جانے کی تاریخوں میں تغیر کرنا پڑے گا [6] ص ۳۸۱ [7] ورق ۴۰۱ [8] بحوالہ میخانہ: حاشیہ نمبر ۹ ص ۳۸۰ [9] ص ۲۳۷ [10] ورق ۴۰۱ [11] ص ۳۸۲-۳۸۳،

۱۔ قصاید

۲۔ غزلیات

۳۔ ترجیعات

۴۔ مثنویات (ا) داستان باغ

(ب) داستان کوہ کوفتن فرہاد، یہ وہی داستان ہے جس کے ۲۳ شعر ہفت اقلیم میں مندرج ہیں،

(ج) در مدح بادشاہ زمان

(د) مثنوی در تعریف شتر، در تعریف شبدیز، در تعریف خسرو شیریں، ممکن ہے یہ جزو "ب" کا تکملہ ہو،

۵۔ رباعیات

تعداد اوراق ۱۴۲

اب خواجہ شریف کی بہن کے سلسلہ کے چند افراد کا ذکر کر کے، نور جہاں کے پدری سلسلہ کا ذکر ختم کر دیا جائے گا، خواجہ مذکور کا ایک بھانجا خواجہ عبد الرضا[1] تھا، جس نے فن خطاطی میں بڑی دستگاہ پیدا کی تھی، اور "سیاق و ترسل" میں بھی کافی نامور ہو چکا تھا، اس نے موزوں طبیعت پائی تھی، اور آبدار اشعار اس کی یادگار تھے، مگر ہفت اقلیم لکھتے وقت مولف کے سامنے نہیں تھے، چنانچہ اس نے اس کی کہی ہوئی صرف دو تاریخیں درج کی ہیں، ایک شاہ قاسم کی وفات کی، جو "وفات شاہ قاسم" سے نکلتی ہے، دوسری "محمود بیگ نامی" کی عروسی کی، جو "الٰہی عاقبت محمود گرداں" سے حاصل ہوتی ہے،

خواجہ محمد رضا، خواجہ عبد الرضا کا فرزند رشید تھا، وہ بڑا ہونہار اور شاعری کے میدان میں ابتدا ہی سے گامزن تھا، مگر بدقسمتی سے کم عمری میں انتقال کر گیا،

"اما از ناسازگاری روزگار مراحل چند از عمرش طی نشدہ بود کہ ربیع انتعاشش بخزان ارتحال مبدل گشت"۔

---

[1] ہفت اقلیم ورق ۴۰۲

مگر اس نے کمسنی ہی میں کافی اشعار لکھ ڈالے تھے، مگر ہفت اقلیم کے مولف کے پیش نظر صرف

چند تھے، کلام کا نمونہ ہے:

گلرخان از پی آزار دردل می آرند   بلبلی را کہ بگلزار درد دل می آرند

شدہ ام کافر زلفی کہ مسلمانی را   از ورش ہمچو گنہگار درد دل می آرند

ای رضا بخت مساعد یکسانی یارست   کہ بکاشانۂ خود یار درد دل می آرند

خواجہ محمد محسن[۱]: یہ خواجہ عبد الرضا کا بھانجا تھا، امین احمد نے اس کے حسن خلق، نیکوروشی

اور لطافت طبعی کی بڑی تعریف کی ہے،

خوبی ذاتش زیادہ بر آنکہ در تحریر آید و نیکوئی صفاتش او فزاز آنکہ در تقریر گنجد"۔

اس نے شاعری کو مشغلہ نہیں بنایا تھا، اس وجہ سے اس کا کوئی تخلص بھی نہ تھا، لیکن کبھی کبھی

جب شعر و شاعری کرتا تو اس طرح کے اشعار آبدار نظم کرتا۔

دل من رنگ و بو نمیدانند   ہوس و آرزو نمیدانند

در جہان خدای ہرچہ بود   غیر ردی نکو نمیدانند

مستم از بادۂ کہ نشۂ او   نام جام و سبو نمیدانند

حسن را دیدۂ دل بیدار   خوبی چشم و رُو نمیدانند

روز پروانہ حسن شمع بپرس   کہ بجز جان او نمیدانند

اشک خونین و آہ سوزانم   رہ چشم و گلو نمیدانند

داغ عصیاں بآتش دل شوی   آب این شست و شو نمیدانند

دیدہ از نادیدن رویت بدیدن دشمن است   گل چو رفت از بوستان بلبل بگلشن دشمن است

خانۂ دل را بپردازد ہوس بنغم نشین   باد دل بیارزد این چرخ توسن دشمن است

---

[۱] ہفت اقلیم ورق ۲۰۴

چند گوئیدم کہ پنہاں دار راز عشق را   چون کنم پنہاں کہ این گوہر بمخزن دشمنست

نور جہاں کے مادری سلسلہ کے چند افراد کا ذکر سطور ذیل میں درج ہوتا ہے:

نور جہاں کا نانا آقائی ملا، قزوین کا رہنے والا اور شاہ طہماسپ کے دربار میں بڑا رسوخ رکھتا[۱]

تھا، اس کا سلسلۂ نسب[۲] شیخ شہاب الدین سہروردی (وفات ۶۳۲ھ) تک پہنچتا ہے، آقا ملا

خوش سلوک[۳] اور سلیم النفس تھا، ہفت اقلیم میں اس کی سیرت کی بڑی تعریف ہے، تصفیۂ خاطر،

تزکیۂ نفس، حسن خلق، حسن صورت و نجابت ذات، نیکوئی صفات و لطافت طبع سے موصوف

اور کمالات نفسانی و اسباب بزرگی کی تحصیل میں بے مثل تھا، اس کی ملاقات پسندیدہ اور

اس کی گفتگو نہایت سنجیدہ ہوتی، اگرچہ علوم[۴] متداولہ میں چنداں دستگاہ حاصل نہ تھی، مگر اس کے

باوجود اس کے خمیر ذات میں جتنی خوبیاں تھیں، وہ بیان سے باہر ہیں، ہفت اقلیم میں[۵] ہے:

"چہ آب از لطف طبع او لطافت وام میگیرد و آتش از ذکائے خاطر او تیزی

می رباید"

بہت رنگین، مجلس افروز اور خوش صحبت تھا، مستعار زندگی کو خوش حالی و خرمی سے

گذارتا تھا، اگرچہ باقاعدہ شاعر نہ تھا

"ردیف طبعش توسن اندیشہ را رام خود نساختہ"

لیکن گفتگو میں فی البدیہہ اشعار پیش کرتا، چنانچہ یہ دو بیت حافظ نامی ایک شخص کے لیے

نظم کیے تھے۔

ریش حافظ فتیلہ را ماند   بال یابوی نیلہ را ماند

حافظ اندر میانۂ ریشش   راستی کرم پیلہ را ماند

---

[۱] و [۲] مآثر الامرا ج ۱ ص ۹۰ [۳] عالم آرای عباسی ص ۱۶۵ - ۱۶۶ [۴] ہفت اقلیم ذیل قزوین [۵] ایضاً

اس سے ملا کی شوخی طبیعت کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے۔

ملاے مذکور کے چار لڑکے تھے۔ بدیع الزماں، خواجہ غیاث الدین علی، مرزا احمد بیگ اور آقا محمد زمان، ان میں سے تین یعنی بدیع الزماں، مرزا احمد بیگ اور محمد زماں کا نام عالم آرائی عباسی میں آیا ہے۔ بدیع الزماں شاہ طہماسپ کے عہد میں کاشان[1] کا وزیر تھا، اور اس کے سب بھائی سلامت نفس اور رعایا کے ساتھ حسن سلوک کی بنا پر شفقت شاہانہ سے بہرہ ور تھے، اس کا ایک بھائی آقا محمد زمان تبریز میں بعض اہم عہدوں پر فائز تھا، اور دوسرا بھائی احمد بیگ خراسان میں بعض محال کا وزیر تھا۔ غیاث الدین علی کا نام بظاہر اس وجہ سے شامل نہیں ہو سکا کہ وہ کسی بڑے عہدے پر ممتاز نہیں تھا، اس کے برعکس مآثر الامرا[2] میں محمد زمان کا نام نہیں آیا ہے، اور خواجہ غیاث الدین کے ضمن میں اس کے دونوں بھائیوں یعنی بدیع الزماں اور مرزا احمد بیگ کو وزارت بلاد ایران سے منسوب بیان کیا ہے، ان چار بھائیوں میں صرف مرزا غیاث الدین علی ہندوستان آیا تھا، اس لیے اس کے حالات کچھ زیادہ معلوم ہیں، جو ذیل میں درج ہیں:

خواجہ غیاث الدین علی "طلاقت لسانی"[3] اور "بردلی" میں نہایت نامور تھا، جب ہندوستان آیا تو اکبر کے عنایات سے سرفراز ہوا، اور بخشی گری کے عہدہ پر فائز کیا گیا، ۹۸۱ھ میں جب گجرات کے نوروزہ مہم میں نمایاں کام انجام دیا، تو آصف خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا، اور اسی وقت سے مرزا کوکہ کے ساتھ منسوب کر دیا گیا کہ وہاں اصلاح کی کوشش کرے۔ ۹۸۴ھ میں احمد آباد کے مضافات امد میں بعض امرا کے ساتھ وہاں کی شورش دفع کرنے کے لیے متعین ہوا، اور اس مہم میں ایسی نمایاں خدمت انجام دی کہ دشمن کو پسپا ہونا پڑا، ۹۸۵ھ کے آخر میں اس کے اعزاز

---

[1] ص ۱۶۶ [2] تاریخ الفی میں ۹۸۰ھ کے ذیل میں مرزا جعفر نے اپنے والد کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح انھوں نے کاشان کے نقطویوں کا قلع قمع کیا تھا [3] ج ۱ ص ۹۰ [4] ایضاً ص ۹۱

میں اضافہ ہوا، اور وہ مالوہ کی طرف بھیجا گیا، وہاں سے وہ گجرات گیا، اور اس کی وجہ سے شاہی لشکر میں بڑی آب و تاب پیدا ہوگئی، آصف خاں آخر عمر تک گجرات ہی میں مقیم رہا اور وہیں ۹۸۹ھ[1] میں انتقال کیا، اس کے کئی لڑکے تھے، جن میں ایک مرزا نور الدین تھا، وہ خسرو خاں[2] کی بغاوت میں شریک ہو گیا تھا، اس لیے اعتماد الدولہ کے لڑکے محمد شریف کے ساتھ ۱۰۱۶ھ میں قتل کر دیا گیا،

مرزا قوام الدین جعفر بیگ آصف خاں[3] = مرزا جعفر بیگ خواجہ غیاث الدین علی کا بھتیجا اور مرزا بدیع الزماں حاکم کاشان کا لڑکا اور نور جہاں کا ماموں زاد بھائی تھا، مرزا جعفر اپنے باپ کے ہمراہ باریاب شاہی ہوا لیکن نہ جانے کن وجوہ سے وہ عازم ہندوستان ہوا، اور اکبری عہد کے بائیسویں سال یعنی ۹۸۵ھ[4] میں بالکل جوانی کے عالم میں ہندوستان پہنچا، اور اپنے چچا خواجہ غیاث الدین کے ہمراہ پادشاہی دربار میں آنے جانے لگا، بادشاہ نے دو سو کا منصب عنایت کیا، مگر اس چھوٹے منصب سے اس کو اطمینان نہ ہوا اور اس نے آمد و رفت بند کر دی، بادشاہ نے ناخوش ہو کر اس کو بنگالہ بھیج دیا، وہاں اس نے نمایاں کام کیے جس سے پھر الطاف خسروانہ کا مورد ہو گیا، چنانچہ

---

[1] ملاحظہ ہو طبقات اکبری ج ۲ ص ۲۴۴ لیکن خلاصۃ الاشعار ورق ۱۰۶۵ پر شہادت لکھی ہے [2] اس بغاوت کی تفصیل تزک جہانگیری میں ملے گی [3] مآثر الامراء ج ۱ ص ۱۰۷ ببعد، ہفت اقلیم ورق ۱۵۱، ۱۵۲، بدایونی ج ۳ ص ۱۶۷-۲۱۷ [4] اسی سنہ میں اس کا حقیقی پھوپھا اعتماد الدولہ مرزا غیاث بھی آیا ہے، مگر دونوں کے ساتھ روانہ ہونے کا پتہ نہیں چلتا، گو قرین قیاس یہی ہوگا، البتہ خلاصۃ الاشعار (ورق ۱۰۶۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سیاسی اسباب کی بنا پر مرزا جعفر نے ترک وطن کیا: "در زمان سلطنت شاہ اسمٰعیل بواسطۂ فتور ارباب مناصب حزن زدۂ جلاء وطن اختیار نمود۔ متوجہ دیار ہند شد۔" لیکن یہ جلاوطن باپ کی وزارت کاشان کے ختم ہونے کے بعد سے متعلق ہے، کیونکہ اسی کتاب میں مذکور ہے کہ مرزا بدیع الزماں کی وزارت کا تعلق زمانۂ طہماسپ سے تھا، اس تذکرہ میں مرزا جعفر کے علم و فضل کی بڑی تعریف ہوئی ہے۔

تھوڑے ہی دنوں میں دوہزاری[1] کے منصب، آصف خانی کے خطاب اور میر منشی گیری کے عہدہ سے سرفراز ہوا، ۹۹۵ھ میں دشت سواد کا تھانہ دار مقرر ہوا، ۱۰۰۰ھ میں جلالہ کے استیصال کے لیے نامزد کیا گیا، اور ۱۰۰۱ھ میں اس کا پورا استیصال کر دیا، ۱۰۰۲ھ[2] میں کشمیر کے لیے نامزد ہوا، اور ۱۰۰۵ھ میں کشمیر کا باقاعدہ حاکم مقرر کیا گیا، ۱۰۰۸ھ میں دیوان کل کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوا، ۱۰۱۳ھ میں بہار کا صوبہ دار مقرر ہوا، ۱۰۱۵ھ میں جہانگیر کی طرف سے عہدۂ وکالت، منصب پنج ہزاری اور قلمدان مرصع عنایت ہوا، اسی زمانے میں سلطان پرویز کے اتالیق کی حیثیت سے دکن روانہ ہوا، وہاں امرا کے آپس کے اختلافات کی وجہ سے نمایاں کوئی خدمت انجام نہ دے سکا، اور وہیں ۱۰۲۱ھ میں راہی ملک عدم ہوا،

امین احمد[3] نے اس کے حسن اخلاق و فہم و فراست کی بڑی تعریف کی ہے، ایک جگہ لکھتا ہے:

بصفت فراست و کاردانی و سمت کیاست و فضائل انسانی اتصاف داشتہ ... از کمال فضل و حدت فہم بجدی است کہ ہمگنان تلطف طبع وی اعتراف نمودہ از ذکای خاطرش اعتراف می نمایند و در علو رفعت و منزلت بدرجۂ کہ بزرگان زمان بعنایت و اعانت او محتاج بود...

مآثر الامرا[4] میں ہے:

"از یکتایان روزگار بود، در ہمہ فن صاحب یکفن، و در ہر ہنر تمام فہم تند و فطرت بلند اوشہرۂ آفاق، خود میگفت ہر چہ سخن بدیہہ نفہمم بمعنی خواہد بود، گویند بیک نگاہ تمام سطر را میخواند در فراست و کاردانی و اجرای مہام ملکی و مالی ید بیضا داشت و بہ ظاہر و باطن آراستہ۔"

[1] طبقات اکبری ج ۲ ص ۴۰۹ میں اس کا ذکر ہے [2] ہفت اقلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۰۲ھ سے قبل وہ وزیر ہو گیا تھا، "خلعت وزارت بر قامت قابلیتش چست آمدہ ... از روز استبداد و استقلال او در امور مملکت و معرفت مقادیر سپاہ و حشم و وقوف بر دقایق مہمات زیادہ بر آنست کہ اندیشہ کمینۂ آن را یابد (ورق ۵۳ ب) [3] ایضاً [4] ج ۱ ص ۱۱۱-۱۱۲

باغ و باغبانی سے بہت شوق اور شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا، جعفر تخلص کرتا تھا، اسکے شعر و انشا، دونوں مسلم ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں[1] کہ اس کی مثنوی "خسرو و شیریں" نظامی کے بعد سب سے عمدہ مثنوی ہے، اس مثنوی کے بہت عمدہ نسخے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، بادلی کے کتب خانے میں اس کے تین نسخے ہیں، جن میں سے ایک کا کاتب عبد الرشید دیلمی اور سنہ کتابت ۹۹۵ھ ہے، اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ یہ مثنوی اس سنہ کے قبل نظم ہو چکی تھی، اور شاعر اس کی تکمیل کے ۲۶ سال سے زیادہ زندہ رہا، مگر اس نسخے میں عنوان خسرو و شیریں کے بجائے فرہاد و شیریں پایا جاتا ہے، تعجب ہے کہ امین احمد[2] رازی نے اس مثنوی کا ذکر نہیں کیا، البتہ مآثر الامرا[3] میں اس کے چند شعر نقل کیے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

در عشرت آرائی خسرو و شیرین می گوید:

ہوس مطلق عنان شد شوق خودکام — سر دست صنم بگرفت با جام
چنین بی نُقل دادن بادہ تا کی — بدہ بوسہ کہ ہم نقل است و ہم می
فتادش تن ز تاب شرم در تب — ز نام بوسہ زد تب خالہ اش لب
ملک بگرفت و شوقش کردہ سرمست — ز دستش جام و بوسیدش لب و دست
صنم ہر دم ز آب دیدہ آں شب — ز نقش بوسہ شستی دامن لب

یہ غزل ہفت اقلیم[4] میں منجملہ اور اشعار کے منقول ہے،

یا بہ صفا و رونق دیگر ہر آئینہ — از عشق پاک حسن وز رو شنگر آئینہ

[1] ملاحظہ ہو مآثر الامرا، ج ۱ ص ۱۱۲ [2] منتخب التواریخ میں بھی بدایونی نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، اس کا بھی سنہ تصنیف ۱۰۰۲ھ ہی ہے، کیا قیاس کیا جائے کہ اس سنہ میں یہ مثنوی نہیں لکھی گئی تھی اور بادلے کے نسخہ کا ۹۹۵ھ مشتبہ ہے، [3] ج ۱ ص ۱۱۲ [4] ورق ۵۳ ب بدایونی نے بھی اس غزل کے ۱۰ شعر نقل کیے ہیں جن میں صرف ایک شعر ہفت اقلیم میں درج ہے،

باشد بہ از بہشت بصد وجہ گر دہد — دست جزا بدستِ تو در محشر آئینہ

صورت ہزار سال بتائید حفظ تو — بعد از زوال اصل نماید در آئینہ

بی ما سِی دشمن اگر آرزو کنی — بندد بر دی صورتِ خصمت در آئینہ

مستغنی است رای تو از غیر خویشتن — جمشید جام دارد و اسکندر آئینہ

شلت اگر محال نمی بود چوں نیافت — عکست ز فیضِ عام رخت جان در آئینہ

جعفر خاں کے لڑکوں میں کوئی بھی اتنا نامور نہ ہو سکا[1]، مرزا زین العابدین ڈیڑھ[2] ہزاری منصبداری اور پانسو سوار مقرر ہوا، لیکن عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور ۱۰۳۹ھ میں مرگیا، اس کا لڑکا مرزا جعفر اچھا شاعر گزرا ہے۔ اس کے دوستوں میں زاہد خاں کوکہ اور مرزا ساقی پسر سیف خاں تھے، آخر میں ترک ملازمت کر کے آگرہ میں سکونت پذیر ہو گیا، شاہجہاں نے سالانہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا، عالمگیری عہد میں بھی مشمول عنایت رہا، ۱۰۹۴ھ میں راہی ملک بقا ہوا،

آصف کے دوسرے لڑکوں میں ایک سہراب خاں تھا جو شاہجہاں کے عہد میں ڈیڑھ ہزاری ذات اور پانسو سوار کا منصبدار مقرر ہوا، مگر جلد ہی وفات پاگیا، دوسرا مرزا علی اصغر تھا، جو نہایت عیاش تھا، جھجھار بندیلہ کی مہم میں متعین ہوا اور وہیں مارا گیا۔

آصف خاں کے پوتے جعفر[3] کے اشعار کا نمونہ ملاحظہ ہو:

نمی دہند بہر بوالہوس ریاست عشق — کسی کہ باب سر دار گشت سردار است

دریں کہ کوہکن از ذوق داد جاں چہ سخن — ہمیں کہ تیشہ بسر و یزد سخن باقی ست

ہزار بلبل شوریدہ خاک شد جعفر — ہنوز رسم خود آرائی چمن باقی است

اس جگہ آصف خاں کی دو چچازاد بہنوں یعنی خواجہ غیاث الدین علی کی دو لڑکیوں کا ذکر

[1] ماثر الامراء ج ۱ ص ۱۱۳ - ۱۱۴ [2] ایضاً

بے موقع نہ ہوگا، ایک لڑکی اعتماد الدولہ مرزا غیاث کے لڑکے مرزا ابو الحسن کو بیاہی تھی، اسی کے بطن سے ملکۂ ارجمند بانو پیدا ہوئی، جو خرم کے عقد میں تھی، اور جو بعد میں ممتاز محل ہوئی اور جس کے نام کا روضہ تاج گنج آج بھی عجائب عالم میں محسوب ہوتا ہے، یہی ملکہ شاہنشاہ اورنگ زیب کی ماں تھی، خواجہ غیاث کی دوسری لڑکی حسام الدین مرزا سے منسوب تھی، اس کی کوئی اولاد اتنی نامور نہیں ہوئی جس کا ذکر ہوتا،

آقائے ملا دو قدار کے چار نامور فرزندوں کا اجمالی ذکر اوپر کی سطور میں ہوا ہے، اسکی ایک نامور لڑکی تھی، جو مرزا غیاث سے منسوب تھی، مرزا غیاث اپنی اس بیوی کے ساتھ عالم فلاکت میں ہندوستان چلا آیا تھا، یہی وہ خاتون تھی جس سے نور جہاں پیدا ہوئی جس نے نہ صرف اپنے خاندان کا نام روشن کر دیا بلکہ جس کی وجہ سے صنف نازک کا نام بالا ہو گیا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

قاسمِ کاہی کا وطن

از جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے لکچرار عربی الہ آباد یونیورسٹی

(۲)

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ آیا قاسم کاہی قلعہ کاہ میں پیدا ہوا تھا، جیسا کہ ڈاکٹر نذیر صاحب عرفات العاشقین کے حوالے سے فرماتے ہیں:- "(۳) تخلص کے سلسلے میں عرفات میں یہ بیان ملتا ہے

"مولدش قلعہ کاہست وبت (سبب؟) تخلص ہمان است وخود گفتہ بود کہ در اوائل حال شخصے از اتراک مرا بالاغ گرفتہ جوال کاہ بر پشت نہاد بدیں سبب کاہی تخلص کردم"

ڈاکٹر ہادی حسن دونوں بیان کو غلط قرار دیتے ہیں اور انتخاب تخلص کی وجہ اس کی خاکساری بتاتے ہیں، مگر اس قیاس کی تائید میں کوئی سند نہیں لکھی، اگر وہ اس بیان کو رد نہ کرتے تو وطن کے سلسلے میں ان کا مفروضہ غلط ہو جاتا، حالانکہ خود ان کے بقول پروفیسر براؤن بھی کاہی کو ایک جگہ کا نام تجویز کرتے ہیں،

Gahi (Kahi) seems clearly a place name:
perhaps of some village near Samarqand."

مجھے اس سلسلے میں دو تین باتیں عرض کرنی ہیں:-

اولاً: اگر عرفات العاشقین کا مذکور الصدر اقتباس ڈاکٹر نذیر صاحب نے بلا کم و کاست نقل فرمایا ہے، تب بھی وہ اس قابل نہیں ہے کہ کوئی محقق اس پر غیر مشروط اعتماد کر سکے کیونکہ

اس کا ایک جز دوسرے کے ساتھ دست وگریباں ہے اسکی تفصیل حسب ذیل ہے:-

فرض کیجئے کہ کاہی کی جائے ولادت قلعہ کاہ تھی اور یہی نسبت اس کے انتخاب تخلص کا سبب تھی [واضح رہے کہ بانکی پور کے نسخہ میں "بت" کا لفظ مجہول المعنی ہے، اور خود ڈاکٹر نذیر صاحب نے اس کی تصحیح قوسین کے اندر "سبب" سے کی ہے] تو پھر اس حکایت کے کیا معنی رہ جاتے ہیں کہ بچپن میں ایک ترک نے اس سے بیگار میں کام لیا تھا، اور گھاس کا گٹھا اس کی کمر پر لادا تھا اس واقعہ کی یاد میں اس نے اپنا تخلص کاہی (گھاس سے نسبت رکھنے والا) رکھا تھا، اس لیے یقیناً ان دو بیانوں میں سے ایک غلط ہے، یا تو وہ قلعہ کاہ میں پیدا نہیں ہوا تھا، یا انتخاب تخلص کی جو توجیہ تقی اصفہانی نے کی ہے، وہ خلاف واقعہ ہے،

اگر علی سبیل التنزل فرض کر لیجئے کہ اصفہانی کا یہ قول کہ "مولدش قلعہ کاہست" صحیح ہے تو ڈاکٹر صاحب کا مبینہ مفروضہ غلط ہو یا نہ ہو، ڈاکٹر نذیر صاحب کا یہ دعویٰ کہ "قاسم کاہی کی پیدائش کوفن ہی میں ہوئی" یقیناً غلط ہو جاتا ہے، کیونکہ کوفن اور قلعہ کاہ میں سیکڑوں کوس کا فاصلہ ہے اور ان میں کسی طرح تطبیق نہیں دی جا سکتی، اس کی تفصیل یہ ہے:

کوفن شہر ابیورد کے قریب اس سے چھ فرسخ کے فاصلہ پر ایک قصبہ کا نام ہے، جیسا کہ یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے:

"کوفن آخرہ نون بلیدۃ صغیرۃ بخراسان علی ستۃ فراسخ من ابیورد احدثہا عبداللہ بن طاہر فی خلافۃ المامون"

اس سے پہلے مقدسی نے لکھا تھا:

"وابیورد اعجب الی من نسا...... مدینتہا محصنۃ ورباطہا کوفن"

(احسن التقاسیم ص ۳۲۱)

عہد حاضر میں لی، اسٹرینج نے لکھا ہے:۔

"نسا کے مشرق میں پہاڑی سلسلوں سے ہٹا ہوا دشت مرو کے کنارے ابیورد واقع ہے.... مستوفی نے یہاں کے پھلوں کی تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ یہاں سے چھ فرسخ کے فاصلہ پر کوفن کا بڑا رباط جو ایک گاؤں میں ہے، ابیورد سے متعلق تھا۔"

جس زمانے میں قلعہ کاہ نے شہرت حاصل کی، اس عہد کا کوئی جغرافیہ ہمارے سامنے نہیں ہے، مگر تاریخ میں جس انداز سے قلعہ کاہ کا نام آتا ہے، اس سے اس کا محلِ وقوع متعین ہو جاتا ہے، کہ یہ ہرات کے قرب و جوار میں واقع تھا، مثلاً تاریخ نامۂ ہرات مؤلفہ سیف بن محمد بن یعقوب الہروی میں مذکور ہے کہ الجائتو سلطان کا دل ملک فخر الدین کرت سے صاف نہ تھا، اس لیے اس نے ۷۰۶ھ میں دانشمند بہادر کو اس کے استیصال کے لیے بھیجا، دانشمند بہادر جب ہرات کے قریب پہنچا تو اس نے فخر الدین کے پاس ایلچی بھیجے، مگر جب ایلچی فخر الدین کے پاس سے کوئی مناسب جواب نہ لائے تو دانشمند بہادر نے قرب و جوار کے امیروں کو اپنی مدد کے لیے بلایا،

"دانشمند بہادر بر آشفت و ہم دراں روز بغراہ و قلعہ کاہ و دہ و اسفزار و ازاب و تولک قاصداں دواند و در حاضر شدن ملوک و امراء ایں مواضع مذکورہ تاکید و مبالغت تمام نوشت۔" (تاریخ نامۂ ہرات ص ۴۶۵)

اس واقعہ میں ملک فخر الدین کرت کے ایک امیر جمال الدین محمد سام نے دانشمند بہادر کو قتل کر ڈالا اور مغلوں کو ہزیمت ہوئی، اس لیے الجائتو سلطان نے دانشمند بہادر کے بیٹے بوجائی کو اس کا بدلہ لینے کے لیے بھیجا، اس نے جا کر ملک فخر الدین کو لکھا کہ قاتلین کو ہمارے حوالہ کر دو، فخر الدین کا جواب اس مرتبہ بھی مناسب نہ تھا، اس لیے بوجائی نے پھر قرب و جوار کے امرا کو بلایا:۔

"بعد ازاں بغراہ و اسفزار و قلعہ کاہ و سجستان و تولک و ازاب قاصداں دوانید و ملوک و حکام ایں ولایات را طلب داشت۔" (ایضاً ص ۵۰۴)

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ مقامات ہرات کے قرب و جوار میں نہیں بلکہ دور دراز فاصلے پر واقع تھے اور مذکورۂ بالا اقتباسات سے صرف اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ دانشمند بہادر اور بوجائی نے ان علاقوں کے ملوک و امرا کو اپنی امداد کے لیے بلایا، تو ایسا نہیں ہے بلکہ یہ تمام مقامات ہرات کے توابع میں سے تھے، چنانچہ ۷۱۴ھ میں جب الجائتو سلطان نے ملک غیاث الدین کے مشورے سے قاضی صدر الدین کو ہرات کے منصب قضا پر مقرر کیا تو ان توابع کا عہدۂ قضا بھی ان کے سپرد کیا، تاریخ نامۂ ہرات میں الجائتو سلطان کا یہ فرمان منقول ہے، اس میں لکھا ہے:

"امروز کسے کہ بحلیۂ علم محلی است و بلباس فضل و ورع آراستہ مولانا معظم ہمام مکرم صدر الحق والدین مولانا اعظم اعلم......است......منصب قضاء خطۂ محروسہ ہرات را با ولایات او چوں فوشنج و جرہ و کوسویہ و ازاب و تولک و ہراترود و فیروزکوہ و غرجستان و جزدون و اسفزار و درہ و قلعہ کاہ و فراہ و غور و گرم سیر تا حد سند بدو مفوض کردہ آمد۔" (ایضاً ص ۶۱۱-۶۱۲)

اس کے بعد کسی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ قلعہ کاہ ہرات کے توابع میں سے تھا، اس لیے کوفن سے سیکڑوں کوس کے فاصلہ پر تھا، چنانچہ بیرونی نے ابیورد کا جہاں سے کوفن چھ فرسخ کے فاصلے پر تھا محلِ وقوع یہ بتایا ہے:

طول البلد ۸۴ ، عرض البلد ۳۷ ، ۲۵ دقیقہ (قانون مسعودی ج ۲ ص ۵۷۱)

اس کے مقابلے میں ہرات کا محلِ وقوع حسب ذیل بتایا ہے:

طول البلد ۸۸ ، ۴۰ دقیقہ - عرض البلد ۳۴ ، ۳۰ دقیقہ (ایضاً)

مذکورۃ الصدر ولایات و مضافات میں سے صرف اسفزار کا محلِ وقوع قانون مسعودی میں یہ بتایا گیا ہے:

طول البلد ۸۹ درجہ، ۲۰ دقیقہ - عرض البلد ۳۳ درجہ، ۴۰ دقیقہ (ایضاً)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہرات سے اس کے مضافات کتنے قریب تھے، اور ہرات ابیورد سے کتنا دور تھا، اور جس طرح اسفزار ہرات کے قریب واقع ہے اسی طرح دیگر مضافات و توابع بشمول قلعہ کاہ بھی اس کے قریب ہی واقع تھے،

غرض تقی کاشی کے مبینہ "کوفن" اور تقی اصفہانی کے مزعومہ "قلعہ کاہ" میں بُعد مسافت اتنا زیادہ ہے کہ دونوں میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت بھی فرض نہیں کی جاسکتی یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان دونوں میں سے ایک بڑا علاقہ تھا جس کا ایک حصہ دوسرے کے نام سے موسوم تھا،

اس تحقیق سے مسٹر سیڈون کے اس قول کا ضعف بھی ظاہر ہو گیا ہو گا جو انھوں نے احسن التواریخ کے ایڈیشن میں قاسم کاہی کے بارے میں لکھا ہے کہ

'Gahi (Kahi) seems clearly a place name: perhaps of some village near Samar-gand

اور باتوں کی تنقیح آگے آرہی ہے، اوپر کے بیان سے یہ پوری طرح ثابت ہو گیا کہ قلعہ کاہ سمرقند کے پاس نہیں بلکہ ہرات کے پاس واقع تھا، جو سمرقند سے منزلوں دور تھا،

بہر حال اگر تقی اصفہانی کے قول کو کہ "مولدش قلعہ کاہ است" صحیح مانا جاتا ہے تو تقی کاشی کے قول کو کہ "سید مشار الیہ در کوفن کہ یکے از ولایت آنجا است متولد شدہ" غلط مانے بغیر چارہ نہیں، اور اگر تقی کاشی کے خلاصۃ الاشعار پر اعتماد کیا جائے تو عرفات العاشقین کے دعوی کو بے سر دپا کہنا پڑے گا، لہٰذا ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کے تخطیہ سے پیشتر ڈاکٹر نذیر صاحب کو اپنا موقف متعین

کر لینا چاہیے کہ وہ ان دو متضاد روایات میں سے کس کو رد کرتے ہیں،

اس بحث کے اختتام سے پہلے اس سلسلے میں یہ توضیح بھی ضروری ہے کہ کوفن نام کا عربی و فارسی کتابوں میں صرف ایک ہی مقام ملتا ہے جو ابیورد سے چھ فرسخ کے فاصلہ پر ہے لیکن بابر نامہ میں ایک اور کوفن کا تذکرہ ملتا ہے، جو اس علاقے میں واقع تھا، جسے قدیم زمانے میں سغد کہتے تھے، اور جو بابر کے زمانے میں میاں کال کے نام سے موسوم تھا، اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے، پھر بھی اصل مسئلہ اپنی جگہ پر رہتا ہے کہ وہاں کوفن ابیورد کے نواح میں تھا، یہاں اور دور ماوراء النہر میں پہنچ گیا اور قلعہ کاہ یقیناً ہرات کے توابع و مضافات میں سے ہے، اس لیے تقی کاشی کے "کوفن" اور تقی اصفہانی کے "قلعہ کاہ" میں تطبیق ناممکن ہے،

غالباً تقی اصفہانی نے قاسم کاہی کے مولد کے متعلق کسی قابل اعتماد ماخذ سے معلومات حاصل نہیں کیں، اس نے یا اس کے ماخذ نے "کاہی" کو صفت نسبتی سمجھ کر اسے کاہ کی جانب منسوب کردیا، لیکن چونکہ اس نام کا کوئی مقام نہ تھا، اور قلعہ کاہ قرون وسطیٰ میں ایک ولایت کی حیثیت سے مشہور تھا، اس لیے بلا تکلف اس قیاس آرائی کو ایک تاریخی واقعے کی حیثیت سے سپرد قلم کردیا،

"مولدش قلعہ کاہ است و بت (سبب؟) تخلص ہمانست"

مسٹر سیڈون جنھوں نے احسن التواریخ کو ۱۹۳۴ء میں گائیکواڈ اورینٹل سیریز کے سلسلے میں ایڈٹ کیا ہے، غالباً قلعہ کاہ سے واقف نہ تھے، لہٰذا انھوں نے کاہی کو "کاہی" کا باشندہ سمجھ لیا اور چونکہ احمد امین رازی صاحب ہفت اقلیم نے اسے شعرائے سمرقند کے ضمن میں بیان کیا ہے، اس لیے اس مزعومہ "گاہی (یا کاہی)" کا محلِ وقوع سمرقند کے قریب فرض کر لیا۔

"Gahi (Kahi) seems clearly a place name: perhaps of some village near Samargand"

(ملاحظہ ہو احسن التواریخ ج ۲ ص ۲۸۱)

ثانیاً: احمد امین رازی کا اس صراحت سے سکوت کہ "مولدش قلعہ کاہست" اس کے سوا اور
کسی سبب سے نہیں ہو سکتا کہ وہ اسے زیب داستاں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، حالانکہ بقول
ڈاکٹر نذیر عرفات العاشقین اور ہفت اقلیم علی الاقل اصل واحد سے ماخوذ ہیں، جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

"اس تذکرہ (عرفات العاشقین) میں قاسم کاہی کے حالات درج ہیں، لیکن ان
حالات کی تفصیل ہفت اقلیم سے اتنی مشابہ ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ یہ حالات ہفت اقلیم ہی سے
لیے گئے ہیں، یا ان دونوں کتابوں کا ماخذ ایک ہی ہے۔"

یہ واضح رہے کہ ہفت اقلیم عرفات العاشقین سے بیس یا تیس سال قبل تصنیف ہو چکی تھی،
جب کہ ایسے لوگوں کی زیادہ تعداد موجود تھی جنھوں نے قاسم کاہی سے ملاقات کی تھی، بمقابلہ اس
زمانہ کے (زمانۂ تصنیف عرفات العاشقین) جب کہ قاسم کاہی کے دیکھنے والوں سے زیادہ تعداد
ان لوگوں کی تھی جو "بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے" کے زیادہ مصداق تھے،

اس کے بعد ڈاکٹر نذیر صاحب کا یہ تبصرہ کہ "ڈاکٹر ہادی حسن دونوں بیان کو غلط قرار دیتے
ہیں...... اگر وہ اس بیان کو رد نہ کرتے تو وطن کے سلسلے میں ان کا مفروضہ غلط ہو جاتا" کتنا
بیدردانہ ہے، کاہی یقیناً نہ کسی گاؤں کا نام ہے، اور نہ کسی قلعہ کا جسے "سید مشار الیہ" کے مولد
ہونے کا شرف حاصل ہو، خود ڈاکٹر نذیر صاحب کو اس کا اعتراف ہے:

"قاسم کاہی کی پیدایش کوفن ہی میں ہوئی۔"

اور کوفن یقیناً قلعہ کاہ سے قطعاً مختلف ہے، ظاہر ہے، ایک مولود ایک سے زیادہ جگہوں میں
"متولد" نہیں ہو سکتا، اس لیے میرے خیال میں ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کے لیے اسکے علاوہ اور کوئی
چارہ ہی نہ تھا کہ عرفات العاشقین کی اس "زیب داستاں" کو غلط قرار دیں،

ثالثاً: ڈاکٹر نذیر صاحب کا یہ ارشاد کہ:

"حالانکہ خود ان کے بقول پروفیسر براؤن بھی کاہی کو ایک جگہ کا نام تجویز کرتے ہیں:

Gahi (Kahi?) seems clearly a place name
perhaps of some village near Samarqand"

انتہائی حیرت انگیز ہے جس کی ڈاکٹر صاحب جیسے محقق سے توقع نہیں کی جا سکتی، ڈاکٹر ہادی حسن صاحب
کے الفاظ یہ ہیں:

Where upon Professor E.G. Browne
also gives 962 A.H. as the year of Humayun's
death but emends Gahi to Qasim "My text has
Gahi which I have ventured to emend to Qasim."

پئے تاریخ او گاہی رقم زد   ہمایوں پادشاہ از بام افتاد

The emendation, however, is unacceptable
to Mr. Seddon: "Gahi (Kahi?) seems clearly
a place name: perhaps of some village near
Samarqand."

میرے خیال میں یہ عبارت اس درجہ واضح ہے کہ جب تک آدمی غلط سمجھنے کا تہیہ ہی نہ کرے
اس کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ "Gahi (Kahi)...
....Samarqand" مسٹر سیڈون کا مقولہ ہے، کیونکہ اس کے اوپر مذکور ہے کہ براؤن کی تصحیح
مسٹر سیڈون کو پسند نہیں ہے، خدا معلوم ڈاکٹر نذیر صاحب نے کیسے اس جملہ کو پروفیسر براؤن کی
تجویز سمجھ لیا اور پھر لطف یہ کہ اس مبینہ تجویز کو ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا قول سمجھ لیا، بہرحال

اگر اس عبارت میں ان کے نزدیک کچھ ابہام واشکال تھا تو اس کو براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا اور مسٹر سیڈن کے احسن التواریخ کے ایڈیشن کی مدد سے بآسانی رفع کیا جا سکتا تھا،[1] پہلا اور دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ کاہی کی جائے پیدائش میاں کال ہے یا کوفن، ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا ارشاد ہے کہ

"سید نجم الدین محمد ابو القاسم کاہی ۸۶۶ھ میں میاں کال میں پیدا ہوا تھا، جو سمرقند اور بخارا کے درمیان ایک پہاڑی علاقہ ہے۔"

لیکن ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کو اس سے انکار ہے، وہ پورے وثوق کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے قول کی تردید کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں:

"کاہی کا وطن اور مولد کوفن کے بجائے میاں کال قرار دینا صحیح نہیں ہو سکتا۔"

ڈاکٹر نذیر صاحب کی رائے میں ڈاکٹر ہادی صاحب کے "قیاس" کی بنیاد آئین اکبری کا ایک فقرہ ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"لیکن ڈاکٹر ہادی حسن نے اس کی جائے ولادت میاں کال لکھی ہے، ان کے قیاس کی بنیاد آئین اکبری کا یہ فقرہ ہے "قاسم کاہی عرف میاں کالی"۔ جس میں لفظ میاں کالی میں یائے نسبت ہے، یعنی میاں کال والا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے نزدیک اس کے معنی یہ ہوئے "قاسم کاہی جو میاں کال والے کی نسبت سے پکارا جاتا تھا"۔ اس توجیہ کی بنیاد بلوخ مین کا وہ بیان ہے جس میں اس نے "میاں کال" کو ایک جگہ کا نام اور اس کا جائے وقوع سمرقند اور بخارا کے درمیان (ایک پہاڑی مقام) بتایا ہے، مگر میرے نزدیک یہ توجیہ قرین قیاس نہیں، آئین اکبری میں عرف کا فقرہ کھٹکتا ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو کال میں "یائے نسبت" زیادہ قرین صحت ہوتی، دوسرے یہ کہ یہ عرف ہندوستان میں بہت عام ہے یعنی اس "ی" کو معروف کے بجائے مجہول پڑھیے تو بات صاف ہو جاتی ہے، تیسرے یہ کہ منتخب التواریخ میں بدایونی نے قاسم کاہی کا عنوان قائم کر کے "میاں کالے" کے نام سے اس کا تذکرہ شروع کیا ہے، اس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ "میاں کالے" اس کا عرف تھا، اس لیے اس کو کسی مقام کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہو سکتا، چوتھے یہ کہ خلاصۃ الاشعار کا بیان نہایت واضح ہے، اس میں صراحۃً نہ صرف اسکا وطن دیا ہے، بلکہ اسکے اجداد کے ترک سکونت کرنے، سغد میں آباد ہونے اور وہاں سے وہاں منتقل ہو کر کوفن میں سکونت پذیر ہونے کا بھی بیان ہے۔"

ڈاکٹر نذیر صاحب کے اس استدلال نے چند سوالات پیدا کر دیے ہیں:۔

ا۔ ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا قاسم کاہی کی جائے ولادت میاں کال لکھنا قیاس (Hypothesis) ہے یا امر واقعہ،

ب۔ ڈاکٹر صاحب کے اس قیاس کی بنیاد آئین اکبری کا ایک فقرہ ہی ہے یا اور بھی شواہد ان کے پیش نظر تھے،

ج۔ میاں کالی میں یائے نسبت (معروف) ہے یا یہ یائے مجہول یعنی "الشیخ الاسود" ہے۔

د۔ میاں کالی میں یائے نسبت والے مفروضہ کی توجیہ کی بنیاد محض بلوخ مین کا بیان ہے یا اور بھی شواہد اس کے مؤید ہیں،

ھ۔ کیا بلوخ مین نے میاں کال کو ایک پہاڑی مقام لکھا ہے،

و۔ کیا میاں کالے "میاں + کالے" سے مل کر بنا ہے، جس کی تائید میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے ایک خارجی اور تین قیاسی دلیلیں دی ہیں،

---

[1] اس سلسلے میں یہ گذارش بے محل نہ ہوگی کہ دیوان کاہی کا جو مخطوطہ مجھے دستیاب ہوا ہے اس میں پہلا مصرع بدینطور لکھا ہے "پئے تاریخ ادکاہی رقم زد" یعنی بجائے قاسم یا کاہی کے کاہی (بیک مرکز) ہے۔

ز۔ قاسم کاہی کا وطن میاں کال تھا یا کوفن۔

(۱) پہلے سوال کے جواب میں افسوس کے ساتھ عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر نذیر صاحب نے ایک محقق کی تحقیق کو قیاس سے تعبیر کرکے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا، ممکن ہے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے تمام مراجع و مصادر کا مطالعہ نہ کیا ہو جس کی تفصیل آگے آرہی ہے،

(ب) دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ یہ صحیح ہے کہ اسلامک کلچر میں ڈاکٹر صاحب نے صرف آئین اکبری کا حوالہ دیا ہے،

"قاسم کاہی عرف میاں کالی: 2. A'in-i-Akbari: I, P. 304"

لیکن خود ڈاکٹر نذیر صاحب کو اعتراف ہے کہ آئین اکبری کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر اور بھی ماخذ تھے.

"ڈاکٹر صاحب نے جن ماخذوں سے کام لیا ہو ان میں حسب ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱۔ نفائس المآثر مصنفہ علاء الدولہ کامی سال تالیف ۹۷۳ھ تا ۹۸۲ھ ......"

نفائس المآثر نہایت قدیم ماخذ ہے، جس کا بقول ڈاکٹر نذیر، ڈاکٹر صاحب نے اس توجہ سے بفرط مطالعہ کیا ہے کہ خلاصۃ الاشعار کو بھول گئے، فرماتے ہیں:-

"تعجب ہے کہ ڈاکٹر ہادی کی نظر یہاں تک نہ گئی، انھوں نے رام پور کے کتب خانے کے نفائس المآثر کا مطالعہ تو کیا مگر اسی کتب خانے کے خلاصۃ الاشعار کے مطالعہ کا انکو موقع نہ مل سکا۔"

ڈاکٹر نذیر صاحب کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صاحب نفائس المآثر کی ملاقات بھی قاسم کاہی سے ہوئی تھی، چنانچہ ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کے پانچ خصوصی مآخذ گنا کر صاحب ہفت اقلیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"غالباً صرف یہی مصنف ہے جس کی قاسم کاہی سے ملاقات نہ ہو سکی ہوگی۔"

غرض آئین اکبری کے علاوہ دوسرے مآخذ بالخصوص نفائس المآثر بھی ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر رہے ہیں اور وہ سب سے قدیم ہے اسلیے سب سے زیادہ مستند بھی ہے، اس میں قاسم کاہی کی جائے ولادت کے بارے میں لکھا ہے:

"کاہی، اسمش مولانا قاسم است، اصلش از میاں کال ماوراء النہر است۔"

رہی منتخب التواریخ تو اس کا ماخذ خود نفائس المآثر ہے، جیسا کہ خود بدایونی کے اعتراف سے ظاہر ہے،

ذکر شعراء عصر اکبر شاہی کہ در نفائس المآثر مذکور اند کہ ماخذ این عجالہ و مشہور بہ تذکرہ میر علاء الدولہ است۔" (منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۷۰)

غالباً آئین اکبری کا ماخذ بھی نفائس المآثر ہے،

احمد امین نے ہفت اقلیم میں کاہی کی جائے ولادت کے بارے میں کچھ لکھا ہی نہیں، تاریخ الفی مجھے نہیں مل سکی اس لیے اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کر سکتا۔

اس تصریح کے بعد یہ فرمانا کہ "ان کے قیاس کی بنیاد آئین اکبری کا یہ فقرہ ہے "قاسم کاہی عرف میاں کالی" صرف اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر نذیر صاحب نے محض اسلامک کلچر کے صفحہ ۵ نوٹ ۲ کو پڑھ کر تنقید کی ہے اور انھوں نے نفائس المآثر کو خود نہیں دیکھا اور اگر دیکھا ہے تو کتمان حق کیا ہے،

(ج) تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جب ایک قدیم اور مستند تذکرے میں یہ تصریح ہے کہ "اصلش از میاں کال ماوراء النہر است" اور بعد کے تذکروں کے حالات اسی سے ماخوذ ہیں منتخب التواریخ نے تو یقیناً اور آئین اکبری نے غالباً اسی سے لیا ہے، اس لیے ان سب کے نزدیک قاسم کاہی کا وطن میاں کال ہی ہوگا جس کی جانب منسوب ہو کر وہ میاں کالی (بیائے معروف یا بیائے نسبتی) کہلاتا تھا۔ "اس "ی" کو معروف کے بجائے مجہول پڑھنے" کا مشورہ ایک شاعرانہ حسن تعلیل سے زیادہ نہیں ہے،

(د) چوتھے سوال کا جواب تفصیلی آئندہ آرہا ہے، جس سے ڈاکٹر نذیر صاحب کے اس قول کا ضعف ظاہر ہو جائے گا کہ

"اس توجیہ کی بنیاد بلوخ مین کا وہ بیان ہے جس میں اس نے میاں کال کو ایک جگہ کا نام بتایا ہے"۔

یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر ہادی حسن صاحب نے اسلامک کلچر میں صرف بلوخ مین ہی کے ترجمہ آئین اکبری کا حوالہ دیا ہے، مگر جس طرح دوسرے سوال کے جواب میں لکھا گیا ہے کہ غالباً زیادہ اور بھی تکمیلی ماخذ بھی ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر تھے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے،

(ہ) پانچویں سوال کا جواب یہ ہے کہ بلوخ مین نے میاں کال کو ایک جگہ اور مقام کا نام نہیں بتایا ہے، یہاں ڈاکٹر نذیر صاحب نے لغت میں تصرف بیجا کیا ہے اور انکا غلط ترجمہ غلط فہمی کا سبب بن گیا ہے، فرماتے ہیں:

"اس نے (بلوخ مین نے) "میاں کال" کو ایک جگہ کا نام بتایا ہے اور اس کا جائے وقوع سمرقند اور بخارا کے درمیان (ایک پہاڑی مقام) لکھا ہے"۔

بلوخ مین کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

"a hilly tract between Samarqand and Bukhara"

Tract کا ترجمہ جگہ اور مقام سے کرنا لغت میں تصرف بیجا ہے، آکسفورڈ ڈکشنری میں Tract کے معنی حسب ذیل ہیں:

"A region area of indefinite (usually large) extent."

یعنی Tract ایک غیر محدود بالعموم وسیع علاقہ کو کہتے ہیں۔

اس سے خواہ مخواہ لفظی گرفت مقصود نہیں ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ساری غلط فہمیوں کا سبب یہی ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر نذیر صاحب فرماتے ہیں کہ "میرے نزدیک یہ توجیہ قرین قیاس نہیں"۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی توجیہ اور قیاس آرائی نہیں، بلکہ امر واقعہ ہے، جس کی تحقیق میں بلوخ مین

نے پوری احتیاط ملحوظ رکھی ہے، چنانچہ بداغ خاں کے ترجمہ کی توضیح میں اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ اسے اس لفظ کی تحقیق نہیں ہو سکی، بلوخ مین کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

The meaning of Mian Kal is still unclear to me

(ترجمہ آئین اکبری جلد اول ص ۴۰۲، فٹ نوٹ نمبر ۱)۔

بعد میں جب اس کی تحقیق ہو گئی اور مستند ماخذوں سے معلوم ہو گیا کہ سمرقند اور بخارا کے درمیان جو وسیع پہاڑی علاقہ ہے وہ میاں کال کہلاتا تھا، تب اس نے لکھا کہ

"Mian Kall is The name of The hilly tract between Samarqand and Bukhara"

(ایضاً ص ۶۱۵)

ان مستند ماخذوں کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

(و) چھٹے سوال کا جواب مفصلاً چوتھے مسئلہ کے ضمن میں دیا جا چکا ہے، اسکی مزید تفصیل یہ ہے: اس دور کے "سفینہ فاموں" میں صرف قاسم کاہی ہی تنہا "میاں کالے" نہیں ہیں بلکہ اور بھی بہت سے میاں کالی تھے، چنانچہ بلوخ مین لکھتا ہے کہ یہ لفظ بار بار آتا ہے:

The adjective Mian Kali occurs frequently

(ترجمہ آئین اکبری ج ۱ ص ۴۰۲، فٹ نوٹ ۱)

مثال کے طور پر قاضی عبد السمیع عہد اکبری کے مشہور قاضی القضاۃ کو بھی میاں کالی لکھا ہے، اسی طرح شاہ بداغ خاں عہد اکبری کے مشہور جگیر دار منصبدار کے بارے میں آئین اکبری میں لکھا ہے:

"شاہ بداغ خاں از نژاد ایمق میاں کال سمرقند"۔ آئین اکبری جلد اول ص ۲۲۳)

سب "میاں کالیوں" کا استقصا تو موجب تطویل ہوگا، لیکن اس کثرت مسمیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ علم (اصطلاحی عرف) نہیں بلکہ اسم نکرہ ہے، جس کی وضاحت کی مزید ضرورت نہیں ہے کہ اصطلاحی عرف بھی علم ہی کی قسم ہے اور علم اسم معرفہ کی قسم ہے جو

کسی خاص شخص یا جگہ کا نام ہو، لیکن عہد اکبری کے مشاہیر کے ناموں کے استقصا سے ثابت ہوتا ہے کہ میاں کالی کسی شخص واحد کا نام نہیں ہے بلکہ اس اسم کے متعدد مسمّٰی ہیں، اس لیے یقیناً یہ اسم معرفہ نہیں ہے، لہذا اسے علَم یا علم کی وہ مخصوص قسم جو اصطلاحِ نحاۃ میں "عرف" کہلاتی ہے، کسی طرح قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ یہ اسم نکرہ ہے، جس کی ایک قسم صفت ہوتی ہے، اور صفت کی ایک قسم صفت نسبتی ہوتی ہے، اس لیے "میاں کالی" "صفت نسبتی" ہے، اور اس کے معنی ہیں "میاں کال والا" نہ کہ کالے میاں (الشیخ الاسود)۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ "میاں کالی" اسم نکرہ ہے اور علَم یا عرف اصطلاحی نہیں ہے تو آئین اکبری میں جو عرف کا نام نہاد "فقرہ" ہے، اسے مقید اصطلاحی معنوں میں منحصر رکھنے کے بجائے وسیع لغوی معنوں پر محمول کیا جائے گا، اور فرہنگ آنندراج کے حوالے سے اوپر لکھا جا چکا ہے کہ عرف کے معنی لغت میں "شناختہ ...... وشناختگی ضد النکر" کے ہیں، اسلیے "قاسم کاہی عرف میاں کالی" کے معنی ہوئے: قاسم کاہی جو میاں کال والے کے نام سے مشہور تھا، اور یہی مفہوم ڈاکٹر ہادی حسن صاحب نے سمجھا ہے، ڈاکٹر نذیر صاحب کی تین قیاسی دلیلوں کا جواب مفصلاً اوپر آ چکا ہے، چوتھی خارجی دلیل کا جواب آگے آ رہا ہے۔

(ز) ساتواں سوال ہے: قاسم کاہی کا وطن میاں کال تھا یا کوفن؟ میرے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا وطن میاں کال بھی تھا اور کوفن بھی، مگر اس paradox کو سمجھنے کے لیے جغرافیہ اور تاریخ کی کتابوں کو کھنگالنے کی ضرورت ہے، اور یہ معلوم کرنا ہے کہ ماوراء النہر، سغد، سمرقند، میاں کال اور کوفن میں کیا نسبت ہے۔

(باقی)

میر احمد علی رسا رامپوری

جناب راز یزدانی رام پوری

مدت سے خیال تھا کہ دور متاخرین میں رام پور کے ایک مشہور شاعر میر احمد علی رسا پر تفصیل کے ساتھ کچھ لکھوں گا مگر مشکل یہ تھی کہ رسا کے پوتے سید زاہد علی صاحب کے پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد ان کا کوئی ایسا قریبی رشتہ دار مجھے رام پور میں نظر نہیں آتا تھا جس سے تمام متعلقہ معلومات مہیا ہو سکیں ــــ یوں تو میں نے ہی ۴۶ء میں آل انڈیا لکھنؤ کے پروگرام "اردو کے گمنام شاعر" کے تحت میر احمد علی رسا پر ایک مقالہ پڑھا تھا، مگر اب وہ مقالہ مجھے بھی کچھ سرسری سا محسوس ہوتا ہے، اسی عالم میں ماہنامہ معارف کی جولائی ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں جناب محمد سخاوت مرزا صاحب بی، اے، ایل، ایل، بی کا ایک مقالہ میری نظر سے گزرا جس کا عنوان ہے "تذکرۂ یارانِ زماں"۔ اس مقالے کو پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ "تذکرۂ خمخانۂ جاوید" کے مؤلف نے میر احمد علی رسا رام پوری اور شیخ احمد علی رسا لکھنوی دو جدانہ شخصیتوں کو ایک سمجھا، اور ایک ہی لکھا ہے۔

خمخانۂ جاوید کی تیسری جلد میں صفحہ ۳۸۳ سے صفحہ ۴۰۲ تک سترہ ایسے شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے، جو رسا تخلص کرتے تھے، ان میں احمد علی نام کے دو شاعروں کا ذکر ہے، اول صفحہ ۳۸۳ پر وہی عبارت ہے جو معارف کے فاضل مقالہ نگار نے نقل کی ہے، یعنی

سر آمد اذکیا میر احمد علی رسا ابن میر امام الدین رام پوری شاگرد رشید علی بخش بیمار

ان کے بزرگ رام پور میں ملتان سے آئے تھے، خوش فکر رنگین طبع وارستہ مزاج شخص تھے، ۱۲۵۶ھ میں ۵۰ سال کی عمر تھی، لیاقت علمی بہت اچھی تھی، اور مدام مشغلہ سخن رہتا تھا، لیکن وارستگی مزاج کے باعث کلام فراہم (مرتب) کرنے کی نوبت نہ آئی، ورنہ کافی ذخیرہ چھوڑا تھا، متانت اور پختگی بندش کے علاوہ استادانہ رنگ کی جھلک موجود ہے، مولانا عبدالعلی مدراسی فروغ تخلص ان کے شاگرد رشید تھے، بالآخر ۲۰ شوال ۱۲۹۲ھ میں بمقام لکھنؤ سفر آخرت اختیار کیا ؎

تاریخ او فروغ نوشت از سر الم ۔۔۔ احمد علی چہ صاحب فضل و کمال بود

۱۲۹۱ + ۱ = ۱۲۹۲

منشی امیر اللہ تسلیم نے بجواب عریضہ محرم ۱۳۰۹ھ سال وفات تحریر فرمایا تھا، رامپور میں ان کے بیسوں شاگرد تھے، صاحبزادے اوج تخلص کرتے ہیں،

اور صفحہ ۳۹۰ پر دوسرے احمد علی رسا کا یہ مختصر سا ذکر ہے:

"میر احمد علی رسا شاگرد میر علی اوسط رشک جہاں تک تحقیق ہوا ہے، رامپور کے رہنے والے تھے۔"

میں نے زاہد صاحب وغیرہ سے معلومات حاصل کر کے جو مقالہ ریڈیو لکھنؤ سے پڑھا تھا وہ اس سے بہت زیادہ مختلف تھا، یہاں تک کہ پیدائش اور انتقال کی تاریخوں میں بھی اختلاف تھا، یعنی میری تحقیق کے موافق رسا کی پیدائش ۱۲۳۱ھ میں اور موت ۱۳۰۶ھ میں ہوئی تھی، اس جگہ پہنچ کر میں نے منشی امیر احمد مینائی مرحوم کے لکھے ہوئے تذکرے "انتخاب یادگار" کا مطالعہ کیا، اس تذکرے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تاریخ تحریر یعنی ۱۲۹۰ھ تک کے تمام ان شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے، جو (۱) رام پور کے دربار سے متوسل رہے، خواہ ان کی پیدائش بیرون رام پور کی ہو، مثلاً غالب، داغ، امیر، جلال اور تسلیم وغیرہ (۲) رامپور کے ان تمام شاعروں کا ذکر ہے جو ۱۲۹۰ھ تک مر چکے تھے یا زندہ تھے، خواہ وہ بیرون رام پور رہے ہوں اور بیرون رام پور ہی ان کا انتقال ہوا ہو،

"انتخاب یادگار" میں حضرت امیر مینائی مرحوم نے صرف دو ایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے جو رسا تخلص کرتے تھے چنانچہ صفحہ ۱۴۶ پر ہے،

"رسا میر احمد علی ابن سید امام الدین چھبیس سال کی عمر ہے، مزاج وارستہ طبیعت رنگین سخن شناس سخن آفریں، شیخ علی بخش بیمار کے شاگرد ہیں، بہت کچھ کہا ہے، مگر آزادہ طبعی سے دیوان مرتب نہیں کیا، کچھ کلام اپنا انتخاب کر کے دیا، وہ لکھا گیا۔

اور دوسرے رسا منشی امبہ پرشاد رسا لکھنوی (داستان گو) شاگرد مرزا محمد تقی خاں ہوس، جن کی عمر ۱۲۹۰ھ میں پچاسی سال کی بتائی ہے، انتخاب یادگار کے مطالعہ سے ایک نئی الجھن یہ پیدا ہو گئی کہ میرے علم و یقین میں رسا کا انتقال ۱۳۰۶ھ میں ہوا، اور بعمر پچھتر سال اسلئے ۱۲۹۰ھ میں ان کی عمر چھبیس سال کے بجائے انسٹھ سال کی ہونا چاہیے، اگر چھبیس کو چھپن سمجھ کر طبع شدہ چھبیس کو کاتب کی غلطی کہا جائے تو بھی تین سال کا فرق رہتا ہے، دوسری بڑی الجھن یہ پیدا ہوئی کہ ماہ نامہ معارف کے جس مقالہ کا میں ذکر کر چکا ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ "تذکرۂ یاران زماں" کے مولف احمد علی نے اپنے جو حالات لکھے ہیں، ان سے اور خمخانہ جاوید اور تذکرہ "شمع انجمن" سے ظاہر ہوتا ہے کہ۔

(۱) رسا نے حکومت برطانیہ کی ملازمت کی، وہ تحصیلدار کے عہدے تک پہنچے اور آخر عمر میں پنشن پا کر ریٹائر ہوئے (۲) ان کے کسی بیٹے کا نام امجد علی تھا (۳) وہ کشمیری الاصل تھے (۴) وہ مولانا ظہور احمد کے مرید تھے (۵) لکھنؤ میں مکان تھا جس میں چوری کی واردات ہوئی تھی (۶) ابتدائے فارسی شاعری میں طالب علی خاں عیشی اور محمد حیات خاں بیتاب سے اصلاح لی (۷) ۲۰ شوال ۱۲۹۲ھ کو انتقال ہوا (۸) قبر لکھنؤ میں ہے (۹) کوئی نواسے منشی احمد حسین تھے (۱۰) رسا کے ایک ماموں مولانا ظہور الحق محلی تھے اور دوسرے ماموں شیخ محمد محسن (۱۱) رسا کے دو چچاؤں کے

نام علی الترتیب شیخ اسد علی اور شیخ محمد بخش تھے (۱۲) رسا کی ایک مطبوعہ مثنوی فارسی زبان میں "نشتر غم" کے نام سے ہے (۱۳) رسا نے ایک تذکرہ "یارانِ زمان" کے نام سے لکھا ہے جو فی الحال نایاب ہے، اور اس میں اپنے "یاران رام پور" کا ذکر بھی کیا ہے۔

اس موقع پر مجھے پھر رسا کے پوتے اور اوج کے بیٹے سید زاہد علی صاحب یاد آئے اور میں نے انھیں نوشہرہ چھاونی ضلع پشاور کے پتہ سے خط لکھا، جس کا جواب مجھے پرسوں (۹ اگست ۶۵ء) ملا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

"میرے دادا کا ان حالات سے کوئی تعلق نہیں اور جو خاندانی حالات مجھے یاد تھے وہ لکھ دیے ہیں، خدا کرے آپ کی ضرورت حل ہو سکے۔"

میرے سوالات کے جو جواب سید زاہد علی صاحب نے دیے وہ سوالات کے نمبر کی ترتیب سے درج ذیل ہیں:۔

(۱) کبھی نہیں کی (۲) نہیں تھا (۳) ہرگز نہیں بخاری الاصل تھے (۴) وہ پیری مریدی نہیں کرتے تھے (۵) لکھنؤ سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں تھا (۶) رسا صاحب صرف حضرت بیمار کے شاگرد تھے، اور شیخ علی احمد صاحب فاضل فارسی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی (۷) ۱۳۰۶ھ میں بمقام رامپور انتقال ہوا، (۸) رام پور میں اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے (۹) نہیں تھے (۱۰) نہیں تھے (۱۱) غلط ہے، (۱۲) نہیں ہے (۱۳) نہیں لکھا،

اس کے ساتھ ہی سید زاہد علی صاحب نے ازراہ کرم میر احمد علی رسا رام پوری کے مفصل حالات اور کچھ کلام دونوں چیزیں مجھے بھیج دیں، ان حالات کا خلاصہ اور کلام پر رائے درج ذیل ہے،

"سید احمد علی رسا (ولد امام الدین) کے دادا صاحب مولوی سید محمود علی بخارا کے رہنے والے تھے، مولوی سید محمود علی صاحب اپنے بعض اعزاء جو ملتان، جھجر اور حیدر آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، ... ملنے اور سیاحت کی غرض سے ہندوستان تشریف لائے، مولوی سید محمود علی صاحب بسلسلہ

سیاحت رام پور آئے، تو فرمانروائے وقت کو کسی ذریعہ سے ان کی آمد کا پتہ چل گیا، نواب صاحب نے ان سے ملاقات کی اور نواب صاحب آپ کے گرویدہ ہو گئے، چنانچہ آپ کو کئی عہدے پیش کیے گئے، مگر آپ نے رام پور کی سیاست میں الجھاؤ سے عدم دلچسپی کا اظہار کیا، اور نواب صاحب کے اصرار کے باوجود ملازمت سے انکار کر دیا، لیکن نواب صاحب نے ان کو رام پور سے کہیں اور نہیں جانے دیا، اور مصاحبین سے مبلغ ۳۰ ماہوار وظیفہ بلا خدمت جاری کر کے ریاست میں قیام رکھنے پر مجبور کر دیا، سید محمود علی کا سلسلۂ نسب ساتویں پشت میں حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے ملتا ہے، سید محمود علی صاحب کے تین بیٹے تھے (۱) مولوی سید امام الدین صاحب (۲) مولوی سید جلال الدین صاحب جن کو فرماں روائے وقت نے دو محلہ کے متصل مکانات بنوانے کے لیے آراضی عطا کی اور اب یہ جگہ کوچہ جلال الدین کہلاتی ہے، (۳) ایک پیر ست ولی تھے یہ ہر وقت یاد الٰہی میں مستغرق رہتے تھے، اور ایک دن اسی حالت میں ایسے گھر سے نکلے کہ پھر ان کا کوئی پتہ نہیں چلا، سید احمد علی صاحب رسا مرحوم ولد مولوی سید امام الدین صاحب ریاست رامپور میں ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے، سید احمد علی صاحب بچپن سے ذہین تھے، صغر سنی میں کلام پاک پڑھا، پھر فارسی کی تعلیم رام پور کے مشہور عالم شیخ احمد علی صاحب سے حاصل کی اور عربی کی مکمل تعلیم اپنے والد بزرگوار سے۔ عربی میں حضرت رسا کی لیاقت علمی کا یہ حال تھا کہ اہل عرب پر قواعد میں سبقت لے جاتے تھے، اور ان کی بول چال اور تحریر میں قواعد کی غلطیاں نکالتے تھے، ان عربوں سے نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں کے دربار میں گفتگو رہتی تھی، اور یہ سب حضرت رسا کی زبان دانی اور عربی میں قابلیت کے مداح تھے،

میر احمد علی کو چھوٹی عمر سے شعر کہنے کا شوق تھا، لیکن ان کے والد میر امام الدین شاعری کو اچھی چیز نہیں سمجھتے تھے، اسلیے وہ ان سے چھپا کر شعر کہتے تھے، جب میر امام الدین صاحب کا انتقال ہو گیا، تو

لہ ۳۰ ماہوار پر آجکل تو حیرت ہی ہوگی کہ صرف ۳۰ روپیہ ماہوار، مگر اس عہد کے تیس روپیہ آج کے تین سو پر بھاری اور ان سو زیادہ ہیں کیونکہ یہ بات تقریباً ۱۲۰۰ھ کی نظر آتی ہو یعنی اب پونے دو سو برس پہلے کی جب ۳۰ ماہوار کی بڑی قیمت تھی،

میر احمد علی نے علانیہ شعر کہنا شروع کیا، حضرت بیمار کے شاگرد ہوئے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے، رسا تخلص بھی استاد نے ان کی ذہانت طبع کو دیکھ کر تجویز کیا تھا۔

نواب خلد آشیاں فرمانروائے رام پور ان کی بے حد قدر کرتے تھے، دربار کی حاضری معاف تھی، سنہ ۱۰ ماہوار وظیفہ بلا خدمت جو ابتدا میں ان کے دادا کا مقرر ہوا تھا، وہی ان کے والد کو اور ان کے بعد انھیں بھی ملا، میر احمد علی رسا کی شادی مولوی سید اخوندیار محمد صاحب کی بیٹی سے ہوئی تھی، مولوی سید اخوندیار محمد صاحب شاہ درگاہی صاحب کے خلیفہ تھے۔ اور ان کا مزار حافظ شاہ جمال اللہ صاحب کے مزار سے ملحق چبوترے کے نیچے داہنی جانب ہے۔ اور مزار پر تاریخ وفات کندہ ہے،

سید احمد علی صاحب رسا کی اولاد کی تفصیل یہ ہے:

(۱) سید اسد علی صاحب، یہ نو عمری میں ریاست گوالیار چلے گئے تھے، وہیں ان کی شادی ہوئی اور وہیں ان کا خاندان تھا، جو مرور زمانہ کے ہاتھوں خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچا ہو (۲) سید محمد علی صاحب ان کے بیٹے سید مظفر علی۔ سید مظفر علی صاحب کے بیٹے سید شہزادہ میاں تھے، ان کا بھی انتقال ہو گیا، کوچۂ جلال الدین متصل دو محلہ میں مکان ہے (۳) سید منور علی صاحب۔ ان کے تین بیٹے تھے، جو سب ریاست جے پور چلے گئے، (۴) مولوی سید مہدی علی صاحب، یہ عالم اور صوفی تھے، بہت سے لوگ ان کے مرید تھے، ان کا مزار محلہ پل پختہ میں ہے (۵) سید اکبر علی صاحب، ان کے دو بیٹے تھے جن میں سے ایک کا لاولدی میں انتقال ہوا اور دوسرے کا نام سید اصغر علی عرف پیارے میاں تھا، یہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، مسکونہ مکان ان کا بھی پل پختہ (رام پور) میں ہے، (۶) مولوی فدا علی صاحب، یہ مولوی اور محکمہ دیوانی میں مفتی عدالت تھے،

ل؎ یہ بھی کوئی تعجب کی یا غیر معمولی بات نہیں ہے، اس زمانہ میں اکثر و بیشتر استاد ہی شاگرد کے لیے کوئی ایسا تخلص تجویز کرتے جو کسی نہ کسی طرح اس کے حسب حال بھی ہوتا تھا، مثلاً حضرت غالب نے نواب یوسف علی خاں (عرش آشیاں) کے لیے ناظم تخلص تجویز کیا (مکاتیب غالب) اور استاد ذوق نے نواب مرزا خاں کے لیے ان کی شکل و صورت اور خاندانی حالات کی مناسبت سے داغ تخلص تجویز کیا (تلامذۂ غالب از مالک رام)

کے پیش کار تھے، ان کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہوئیں، دو بیٹے سید ابن علی اور سید منظور علی اور دو بیٹیاں ابھی بقید حیات ہیں (۷) سید عابد حسین صاحب عروج، حضرت رسا کی اولاد میں یہی ان کے جانشین ہوئے، فارسی، عربی کے منتہی اور فن شعر میں اپنے باپ کے شاگرد تھے (دیکھو انتخاب یادگار اور ماہ نامہ نیرنگ ماہ اگست ۱۹۲۵ء) اور چودہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے، ان کے تین بیٹے اور چھ بیٹیاں ہوئیں، سب سے بڑے سید زاہد علی صاحب ہیں جو پاکستان میں ہیں (اور جنھوں نے از راہ کرم یہ حالات مجھے بھیجے ہیں جن کا خلاصہ آپ کے سامنے ہے) دوسرے سید اختر حسین یاس چھوٹے اور تیسرے بیٹے سید حامد میاں نو عمری میں انتقال کر گئے تھے، دو بیٹے اور تین بیٹیاں بقید حیات ہیں،

میر احمد علی صاحب رسا صوفی بھی تھے، مگر نہ کسی کے مرید ہوئے نہ کسی کو مرید کیا، مجلس سماع میں ضرور شریک ہوتے تھے، اور کبھی کبھی ان پر وجد کی کیفیت بھی طاری ہو جاتی تھی، صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، گھنی داڑھی، رنگ گورا، قد متوسط اور جسم دوہرا مائل بہ فربہی، چال میں قدرے لچک، لباس میں ڈھیلا پائجامہ نیچا کرتا، شبنم کا انگرکھا اور سلیم شاہی جوتا، آبائی مکان محلہ پل پختہ میں تھا، اسی میں تمام عمر رہے اور اسی میں انتقال ہوا، رسا کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ تمام عمر کبھی ہفتہ عشرے کے لیے بھی رامپور سے باہر نہیں گئے،

بہتر سال کی عمر میں محرم الحرام ۱۳۰۶ھ کی ساتویں رات کو زیر ناف درد کی شکایت پیدا ہوئی اور پندرہ منٹ کے اندر اتنی بڑھی کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، دوسرے دن ان کے خاندانی ہڑاور میں جو مرزا حافظ شاہ جمال اللہ صاحب کے احاطے کے برابر ہے، دفن کیا گیا۔

کلام پر رائے میر احمد علی رسا کے کلام میں وہ مقامی رنگ بدرجۂ اتم موجود ہے، جس نے رامپور کے ماحول میں آکر جلال، داغ اور امیر کو اپنا رنگ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا، گویا رسا رام پور اسکول کے نمایندہ شاعر ہیں، ان کی شاعری پر تصوف کا اثر ضرور ہے، لیکن ان کی مولویت کا نہیں ہے، مگر وہ عام اردو شعرا کی طرح شیخ یا زاہد و پرہیزگاری کا مذاق بھی نہیں اڑاتے، چنانچہ جب

میں نے ریڈیو پر مقالہ پڑھنے کے لیے زاہد صاحب کے پاس ان کا کلام دیکھا تو مجھے پورے مجموعہ میں اس قسم کا کوئی شعر نہیں ملا، جہاں تک علوئے تخیل کا تعلق ہے رسا مرحوم اپنے دور کے دوسرے شعراء سے کچھ الگ واقع ہوئے تھے یعنی وہ غالب کی طرح میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی، نہیں کہتے تھے لیکن وجود اشیا کو عدم اشیا کی دلیل ضرور مانتے ہیں اور تصوف کے رنگ میں اسکو اس طرح کہتے ہیں،

خزاں کو ساتھ لیے ہم بہار میں آئے

خودداری یا محویت کا یہ حال ہے کہ

کھلا ہے اے رسا باب اجابت
گر فرصت نہیں مجکو دعا کی

رسا کے کلام میں بڑی جدت وندرت ہے، رشک کا یہ پہلو ملاحظہ ہو

جائیں کہیں کو لوگ گر وہم ہے مجھے
ہر اک سے پوچھتا ہوں ارادے کہاں کے ہیں

رشک کا دوسرا پہلو

باد صبا نہ جا چمنِ کوے یار میں
اڑنے کہیں نہ فرق ترے اعتبار میں

تکرار التفات کا مقصد

تکرار التفات ہو مد نظر کسے
کر دیجئے تباہ مجھے اک نگاہ میں

شر سے خیر کا حصول

امید وصل کو دل سے مرے نکال دیا
بلائے یاس نے آئی بلا کو ٹال دیا

رسا مرحوم کے زمانہ میں مناسبات لفظی کا مذاق عام تھا، خصوصاً لکھنؤ اسکول میں اس کی بڑی اہمیت تھی اور اس زمانہ میں لکھنؤ کے بیشتر ارباب فن رام پور میں جمع تھے، اس لیے رسا کا کلام بھی اس سے خالی نہیں ہے، لیکن اس میں بھی بڑی آمد و بے ساختگی اور رامپور اسکول کی مخصوص چھاپ نمایاں ہے، مثلاً

وہ جاتے ہیں شب ہوئی ہے آخر
اندھیر ہے روشنی سحر کی

رسا ملا کے مجھے خاک میں مقدر نے
مری تربت کے غبار انکے دل میں ڈالدیا

قسمت اس کانِ ملاحت سے جدا کرتی ہے
کون اب زخم جگر پر نمک افشاں ہوگا،

"خاندان مومن" کی بلند پروازی رسا کے یہاں زیادہ اور فارسی ترکیبوں کا استعمال کم ہے،

رونق فزائے ناز ہے وہ جلوہ گاہ میں
نور نظر سے آئینہ بندی ہے راہ میں

او جفا جو صرفہ بیداد کیا
میں بھلا کیا اور مری فریاد کیا

بعض مضامین کو رسا نے اپنی فطری ذہانت اور علمی تبحر کی بدولت بڑی خوبی اور صفائی سے نظم کیا ہے:

ایک دن خاک میں ملائے گا
ہم سمجھتے ہیں آپ کا مطلب

بے ترے عمر ہو گئی آخر
زندگی سے تو یہ نہ تھا مطلب

اے رسا ان کو میری بالیں پر
اور دم بھر قیام کرنا تھا

اس لیے ان کے تصور کو نہ رکھا دل میں
کہ پریشاں نہ کہیں خاطر برہم ہی نہ ہے

بعض بعض مقامات پر رسا کی علمی دقت پسندی کا اثر بھی ان کے کلام میں نظر آتا ہے.

الہی دولت بے صورتی بھی پائے اک صورت
نظر آئے مجھے سرمایۂ ہستی عدم میرا

جہاں دیکھا وہاں تو ہے زمیں تیری فلک تیرا
ہے پستی و بلندی آئینہ بے ریب و شک تیرا

کہیں کہیں صوفیانہ رنگ بھی ہے،

ہر دم سفر میں قافلے عمر رواں کے ہیں
معلوم کچھ نہیں کہ ارادے کہاں کے ہیں

ترا ہی تجسس ہے دیر و حرم میں
تجھی کو یہاں اور وہاں ڈھونڈتے ہیں

غرض بہ حیثیت مجموعی رسا کے کلام میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جو اس عہد کے کسی شاعر کو مشہور و ممتاز بنانے کے لیے ضروری تھے، لیکن بد قسمتی سے رام پور میں ۱۹۳۰ء سے پہلے حصول شہرت اور اشاعت کی سہولتیں میسر نہیں تھیں جس سے رامپور کے بہت سے ممتاز شاعر گمنامی میں پڑ گئے،

یہ ہیں میر احمد علی رسؔا رام پوری کے حالات اور ان کی شاعری کا مختصر نمونہ، معارف کے فاضل مقالہ نگار کو شیخ احمد علی رسؔا لکھنوی اور میر احمد علی رسؔا رام پوری کو ایک سمجھنے کا سانحہ "خم خانہ جاوید" کے حالات پڑھ کر ہوا جس میں نام اور شعر وغیرہ تو رسؔا رامپوری کے ہیں اور تاریخ وفات وغیرہ رسؔا لکھنوی کی، لیکن تذکرہ شمع انجمن میں رسا لکھنوی کے حالات ہیں،

حقیقت یہ ہے کہ تذکرہ "یاران زماں" اور "مثنوی" "نشترِ غم" میر احمد علی رسا رامپوری کی تصنیفات نہیں ہیں "تذکرہ یارانِ زماں" میں شیخ احمد علی رسا لکھنوی نے اپنے یاران رام پور کے جو حالات لکھے ہیں ان کی بنا پر یہ سمجھنا کہ شیخ احمد علی رسا لکھنوی رام پور کے رہنے والے اور بیمارؔ لکھنوی کے شاگرد تھے، صحیح نہیں ہے، میرے خیال میں تو وہ اردو کے شاعر ہی نہیں تھے، "شمع انجمن" کے الفاظ اور تذکرہ یاران زماں سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے، رہا یہ امر کہ انھوں نے کسی اردو مثنوی پر اصلاح دی تھی، تو یہ اردو کے شاعر ہونے کی دلیل نہیں ہے، اول تو وہ اصلاح ہمارے سامنے نہیں کہ اس کے عیب و ہنر کا اندازہ کیا جا سکے اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اصلاح صحیح تھی تو اس کے لیے فارسی شاعری کی استعداد کافی ہے،

رہے تذکرۂ یاران زماں میں شیخ علی احمد لکھنوی کے احباب رام پور کے حالات تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ کچھ دنوں رام پور میں رہے ہوں یا متواتر رام پور آتے رہے ہوں، اور اس سلسلہ میں یہاں انکے احباب کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا ہو گا، ان کا تذکرہ رسؔا کے رامپوری ہونے کا ثبوت نہیں، اگر ان کو رام پور سے وطنی یا ملازمت وغیرہ کا تعلق ہوتا تو یادگار انتخاب میں انکا ذکر ضرور ہوتا، غرض شیخ احمد علی رسا لکھنوی اور میر احمد علی رسؔا رام پوری دو جداگانہ شخصیتیں ہیں اور تذکرہ "یارانِ زماں" رسا لکھنوی کا،

وفیات

نواب محمد اسمٰعیل خاں مرحوم

از

پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

نواب محمد اسمٰعیل خاں، نواب محمد اسحٰق خاں کے بیٹے اور نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے پوتے تھے، شیفتہ کو دیکھا نہیں، لیکن ان کی غیر معمولی ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کا حال کتابوں میں پڑھا ہے شیفتہ کی بڑائی میں کیا شک جب حالی اس پر گواہی دیتے ہوں!

نواب اسحٰق خاں یو پی میں سشن جج تھے، ان کے ہم عصر نواب محمد علی بھی، دونوں کے بارے میں مشہور تھا کہ انگریزوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، اس زمانے کے انگریزوں کو! انگریز حکام کا کتنا ہی دباؤ کیوں نہ پڑے فیصلے بے لاگ دیتے تھے، مسلمان نوکری پیشہ طبقے میں ان کے نام فخر و مسرت سے لیے جاتے تھے، جیسے یہ ان کے ہیرو ہوں!

کہنے کو تو کہا جا سکتا ہے کہ دونوں انگریزی سرکار کی ملازمت میں تھے، لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو ان کا درجہ ان لوگوں میں بہتوں سے کم نہ تھا، جو اس زمانہ میں لیڈر کہلاتے تھے، بلکہ بعض اعتبار سے ان کی دلیری کا زیادہ قائل ہونا پڑتا ہے، اس لیے کہ حکومت کی ملازمت میں ہوتے ہوئے ایمان و انصاف کے معاملے میں حکومت کے عتاب کی پروا نہیں کرتے تھے، پنشن پا کر

دونوں نے ام اے او کالج کا انتظام سنبھالا اور اسی خدمت کے دوران میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی!

نواب وقار الملک کے بعد نواب محمد اسحٰق خاں آنریری سکریٹری ہوئے، ان کے عہد کے چند واقعات آج تک یاد آتے ہیں، ایک کلیات خسرو کی تدوین اور طباعت، دوسرا نظام آصف جاہ سادس کا علی گڑھ میں ورود، تیسرے کالج کے یورپین اسٹاف کا متحد ہو کر استعفیٰ دینا اور اس کا منظور کر لیا جانا، نواب صاحب ہی کی سکریٹری شپ کے زمانے میں مسز سروجنی نیڈو علی گڑھ تشریف لائیں، اور اسٹریچی ہال میں وہ مشہور تقریر کی اور ان کے خیر مقدم میں مولانا سہیل نے وہ نظم پڑھی جو اب تک ہمارے دلوں میں تازہ ہے!

دلی کے مشہور داستان گو میر باقر علی کو فن کا کمال دکھانے کے لیے پہلے پہل علی گڑھ میں نواب صاحب ہی نے دعوت دی تھی، پکی بارک کے صحن میں رات کو محفل سجائی گئی تھی، عزت اور محبت کے الفاظ میں نواب صاحب نے باقر علی کا تعارف کرایا تھا، جس کا آخری فقرہ اب تک یاد ہے، "میر باقر علی آج داستان سنائیں گے، کل خود داستان بن جائیں گے"! باقر علی تھے کہ نواب صاحب کے ہر فقرے اور ہر لفظ پر بچھے جا رہے تھے، اور طلبا، کا انداز پذیرائی دیکھ کر جیسے پھولے نہ سماتے تھے،

داستان شروع کی تو یہ عالم تھا کہ کبھی اس طرح محفل سناٹے میں آجاتی جیسے دور دور کوئی متنفس موجود نہ ہو، اور کبھی تحسین و آفریں کے نعروں کا یہ عالم ہوتا کہ دور دور تک کے لوگ چونک پڑتے، کیسے شریف، شایستہ، صحیح المذاق، زندگی کی صحت مند توانائیوں سے لبریز اور تہذیبی روایات سے آراستہ نوجوان طلبہ کا اجتماع تھا، پھر پکی بارک کی وہ فضا جس میں خود کتنی داستانیں کس کس رنگ میں کہاں کہاں خوابیدہ و بیدار تھیں!

داستان گوئی یوں تو ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس رات میر باقر علی کی

داستان گوئی کا کمال دیکھ کر یقین آگیا کہ افسانہ طرازی اور افسانہ طراز کیا ہوتے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں، ایسے فنکار کو آپ کیا کہیں گے جو ماضی کو مستقبل کے لیے ہمیشہ زندہ رکھ سکے!

معاف کیجیے گا ماضی کی یاد نے ماضی سے بھی دور کہیں پھینک دیا! ماضی کو میں اپنا کارنامہ نہیں قرار دیتا، یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ قرار دیں، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اپنے آپ کو کبھی کبھی ماضی کا کارنامہ سمجھنے لگتا ہوں! کہنا یہ تھا کہ نواب اسحٰق خاں ہم لوگوں کو لطف اندوز ہوتے دیکھ کر خود بڑے خوش ہوتے تھے، رہ رہ کر قہقہے لگاتے، بوڑھے داستان گو کی پیٹھ تھپکتے، باقر علی فرط مسرت و افتخار سے کھڑے ہو ہو کر تعظیم بجا لاتے، اور عالم کیف و جذب میں پہنچ کر اس طرح داستان سنانے لگتے جیسے آج کی رات آخری تاریخ تھی، اس کے بعد نہ یہ فن رہے گا، نہ فنکار، نہ اس کے قدرداں!

نواب محمد اسحٰق خاں کے خوش ہونے اور قہقہے لگانے کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا کہ نواب اسمٰعیل خاں بھی اپنی خوشی اور خوشنودی کا اظہار اسی طرح سے کرتے تھے، یہ بات نواب صاحب کے مخلص اور معتبر ہونے کی ایک واضح علامت تھی، ان سے مل کر آپ اس تذبذب میں نہیں مبتلا ہو سکتے تھے کہ انھوں نے آپ کا اعتبار کیا یا نہیں، جو بات ان کے دل میں ہوتی وہی زبان پر آتی، اس سے ہم سب کو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں نہ صرف سہولت ہوتی بلکہ لطف آتا اور حوصلہ بڑھتا،

نواب صاحب ہم سب پر بڑے مہربان تھے اور ہم پر بھروسہ کرتے تھے، دلیر اور حوصلہ مند تھے، کوئی نازک موقع آن پڑتا اور بات یونیورسٹی سے باہر پہنچنے والی ہوتی تو وہ ہماری فروگذاشت کو اپنی فروگذاشت بنا لیتے اور ہم پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے دیتے، ہماری عزت کو اپنی عزت سمجھنے والے تو بہت سے مل جاتے ہیں، گو میرا ساتھ ایسوں سے بھی پڑا ہے جو ہماری عزت کو اپنی توہین سمجھتے تھے، نواب صاحب

ذلت کو بھی اپنی ذلت سمجھتے تھے! قبیلے کا سردار ہونے کی ان میں بڑی نشانیاں ملتی تھیں۔

نواب صاحب عرصے تک یونیورسٹی کے ٹریزرر رہ چکے تھے، ملک تقسیم ہوا، تو مستقل وائس چانسلر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب اطراف ملک میں مسلمانوں کی آبرو، جان اور مال کی تباہی وتاراجی کا وہ عالم تھا کہ اتنے دن گذر جانے کے بعد آج بھی ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، یہ قوم بھی جسے مسلمان کہتے کبھی کبھی شرم آنے لگتی ہے، کیسی کیسی ہولناکیوں سے جانبر ہوچکی ہے، لیکن اب تاریخی کارناموں کے بجائے تاریخی رسوائیوں کی خوگر ہونے لگی ہے، قرآن پاک میں اس موقع کے لیے غالباً کوئی وعید آئی ہے، جو یاد نہیں آتی ورنہ ضرور لکھ دیتا،

نواب صاحب جس ذہنی اور روحانی کرب میں مبتلا تھے، اس کا اندازہ کرنا ان لوگوں کے لیے مشکل ہے، جو ان کے قریب تھے نہ صورت حال سے براہ راست واقف، ہر وقت اس کا خطرہ رہتا کہ کہیں یونیورسٹی کا وہی حشر نہ ہو جو دوسری مسلمان بستیوں کا ہوچکا تھا، ہر طرف سے وحشت ناک خبریں آرہی تھیں، غارتگروں کا جتھا علی گڈھ کے آس پاس منڈلا رہا تھا، نواب صاحب جس لیگ کے ارکان اعلیٰ میں سے تھے اس کی لائی ہوئی تباہیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور کچھ کر نہیں پاتے تھے، اس پر مستزاد یہ کہ مسلمانوں کی متاع گراں بہا مسلم یونیورسٹی کو بچانے کی ذمہ داری ان کے سر تھی، مقامی حکام سے بروقت امداد کی توقع موہوم تھی، وہ جو انگریزی میں ایک مثل مشہور ہے کہ فلاں شخص غم یا غیرت کا ایسا شکار ہوا کہ پھر تمام عمر نہیں مسکرایا، کم وبیش یہی کیفیت نواب صاحب کی تھی۔

یہاں پہنچ کر قائل ہونا پڑتا ہے کہ آخر کار منصب نہیں بلکہ شخصیت فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے، ملک تقسیم ہوا ہے تو کانگرس اور مسلم لیگ کی عداوت انتہا کو پہنچ چکی تھی، لیکن کانگرس کے ہر طبقے میں نواب صاحب کی ساکھ قائم رہی، جس کا ثبوت راج گوپال اچاریہ بالقابہ گورنر جنرل ہند کی وہ

تقریر ہے جو انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے اسی سال کے کنووکیشن میں کی تھی، اور نواب صاحب کی خدمات اور خوبیوں کا برملا اعتراف کیا تھا، کانگرس حکومت کے اتنے ذمہ دار اور مقتدر شخص کا مسلم لیگ کے اتنے ممتاز رکن کو اس زمانے میں علی گڈھ آکر سراہنا معمولی بات نہ تھی!

مسز سروجنی نیڈو یوپی کی گورنر تھیں، علی گڈھ تشریف لائیں، ممدوحہ کے اعزاز میں نواب صاحب نے یونیورسٹی کے کچھ لوگوں کو شب میں اپنے ہاں شعروسخن کی ایک مختصر اور منتخب محفل میں مدعو کرلیا تھا، موصوفہ جہاں موجود ہوں وہاں کی گرمی محفل کا کیا کہنا، اس موقع پر اپنے خلوص اور خوش گفتاری سے ایسا کام لیا اور حاضرین میں سے ہر ایک کی فرداً فرداً ایسی دلنوازی کی کہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے فضا ہی بدل گئی ہو، نواب صاحب کو اپنی اور اپنی حکومت کی طرف سے یونیورسٹی کی حفاظت اور حرمت کا اطمینان دلایا، اس زمانے میں حکومت کا شاید ہی کوئی اتنا بڑا آدمی باستثناء چند علی گڈھ کی تالیف قلب میں اس جرأت اور مرحمت کا نمونہ پیش کرنے کی ہمت کرسکتا تھا!

سوچتا ہوں مسز نیڈو ۱۹۱۶ء میں نواب محمد اسحٰق خاں کی آنریری سکریٹری شپ میں ان کی دعوت پر علی گڈھ تشریف لائیں اور اپنی بے مثل خطابت سے بقول سہیل مرحوم

شکست رنگ ساحری چو زد نوائے شاعری نمود سحر سامری اگر در خطاب زد!

کا کیسا سماں پیدا کردیا تھا، پھر تیس بتیس سال گذر جاتے ہیں، نواب اسحٰق خاں کے فرزند علی گڈھ کے وائس چانسلر ہوتے ہیں، ملک میں تقسیم کا تہلکہ مچا ہوا ہے، مسلمان خاک وخون میں ملائے جانے لگتے ہیں، علی گڈھ نرغے میں آجاتا ہے تو وہی مسز نیڈو کسی کے بلائے بغیر علی گڈھ پہنچتی ہیں اور اپنی شرافت اور مرحمت سے نواب صاحب اور ہم سب کو ڈھارس دیتی ہیں اور اس ادارے کو تاراج ہونے سے بچانے میں گرانقدر حصہ لیتی ہیں، آج بھی جبکہ صورت حال بہت کچھ بدل چکی ہے مسز نیڈو اور اس

صوبے میں ان کی گورنری اکثر بے اختیار یاد آتی ہے اور محزوں بنا جاتی ہے، قانون کہتا ہے گورنر کیا کرسکتا ہے، قانون کا یہ کہنا سچ ہے۔ اس لیے کہ اپنے بارے میں کچھ کہنے والا اس سے زیادہ مستند اور کون ہوسکتا ہے، لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ قانون بنانے والوں اور خود قانون کو یہ معلوم ہو کہ شخصیت کیا کرسکتی ہے!

یادوں کے سلسلے میں باتیں بھی کہاں کہاں پہنچیں! نواب صاحب کو سب سے پہلے غالباً سنہ ۱۹۲۰ء میں ان کے دولت کدہ "مصطفےٰ کاسل" میرٹھ میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں میرٹھ میں ایک پراونشل ٹینس ٹورنامنٹ ہوتا تھا جس میں شرکت کرنے کے لیے کالج سے ٹیم گئی تھی، اور نواب صاحب کی مہمان ہوئی تھی، ان ہی دنوں مسعود ٹامی مرحوم[1] میرٹھ میں غالباً نائب تحصیلدار تھے، مسعود ٹامی کو خبر لگ جائے کہ علی گڈھ سے طلبہ آئے ہوئے ہیں تو ملنے کے لیے فرط محبت سے بے قرار ہوجاتے تھے، موٹر لے کر مصطفےٰ کاسل پہنچے اور نواب صاحب سے کہا، نواب صاحب، کلکٹر صاحب نے آج کی چھٹی لے لی ہے، آپ بھی ان لڑکوں کو چھٹی دیدیجیے، سب کو پکنک پر سردھنے کا گرجا دکھانے لیجاؤں گا،

[1] مسعود ٹامی کی بذلہ سنجی، شوخی اور تفریحی شرارتوں کے قصے اس زمانہ میں ہر علی گڈھ والے کی زبان پر تھے، ایک دن یونین کا جلسہ تھا، اچھے اچھے مقرر موجود تھے، مسعود ٹامی بھی کہیں سے آنکلے، حاضرین نے بے اختیار نعرہ لگایا، کہ مسعود ٹامی بھی تقریر کریں، وائس پریسیڈنٹ (اب پریڈینٹ) نے کہا کہ مسعود صاحب سب سے آخر میں تقریر فرمائینگے، تاکہ وہ دوسری تمام تقریروں پر تبصرہ فرماسکیں، وقت آنے پر مسعود صاحب ڈائس پر تشریف لائے اور "ڈمب شو" شروع کردیا، یعنی ہر مقرر کے سراپا اس کی تقریر اور انداز تقریر کو زبان سے نہیں بلکہ اعضا و جوارح کی حرکات و سکنات سے دکھانا بتانا شروع کیا، جیسے اسکرین پر خاموش تصاویر دکھائی جاتی ہیں، گانے اور ناچنے کے فن کے ماہر آدمی اور حرکات سے مختلف کیفیات کا اظہار شاید اس خوبی سے کرپائیں جیسی مسعود ٹامی نے اس موقع پر تقریر کرنے والوں کی خاموش نقل ہم کو دکھائی تھی، حاضرین کس طرح سے لطف اندوز ہوئے ہوں گے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے،

کھانا ساتھ ہے، لنچ اور سہ پہر کی چائے وہیں ہوگی، شام تک سب کو واپس پہنچا جاؤں گا، نواب صاحب نے فرمایا، لے جاؤ، خاطر مدارات خوب کرنا، صرف اپنی عادتیں نہ سکھانا، یہ کہکر ایک قہقہہ لگایا، ٹامی مرحوم بھی ہنس پڑے اور بولے، نواب صاحب کاش عادت سکھا دینا اتنا ہی آسان ہوتا جتنا آپ کو اندیشہ ہے! پھر دونوں نے قہقہے لگائے اور ہم سب مسعود ٹامی کے قبضے میں چلے گئے!

اب کیا بتاؤں اور کیونکر بتاؤں کہ مسعود ٹامی ہم سب کو لے کر چلے ہیں تو ان کی سرخوشی کا کیا عالم تھا، جیسے زندگی کی کوئی بہت بڑی آرزو دفعتہً پوری ہوگئی ہو! علی گڈھ اور علی گڈھ کے طلبہ پر مسعود ٹامی کی حد تک فریفتہ میں نے کسی اور کو اب تک نہ پایا، ہر اعتبار سے کتنا حسین مردانہ پیکر، سرخ سپید رنگت، بالکل جیسی اس زمانے میں انور پاشا کی روغنی تصویر جابجا آویزاں ملتی تھی، ہر وقت خوش رہنا اور ساتھیوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا، کیسا ذہین اور محبت کرنے والا شخص، باربار علی گڈھ کا ذکر اور ہم پر "نوازشہائے پیدا و پنہاں"!

آج کے "مصطفےٰ کاسل" کو دیکھکر چالیس برس یا اس سے بھی پہلے کے "مصطفےٰ کاسل" کا اندازہ لگانا مشکل ہے، کتنی خوبصورت شاندار عمارت، وسیع باغ، کیسے کیسے اور کتنے گھنیرے تناور درخت جو کبھی کبھی اتنے درخت نہیں معلوم ہوتے تھے، جتنے پرانے زمانے کے سورما اور ان کی "داستانہائے رزم و بزم"۔ ایسے دیوپیکر درخت اتنی تعداد میں اس قرینے سے یکجا وسط شہر میں میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے، عمارت کے وسط میں ایک مختصر سا عجائب خانہ تھا جس میں طرح طرح کے نوادر قرینے سے سجائے گئے تھے، ایک چیز اب تک یاد ہے، ہاتھی دانت میں ایک نسوانی پیکر تراشا گیا تھا جس کی اونچائی غالباً ۸-۱۰ انچ ہوگی، اس وقت اس کو دیکھکر کچھ اس طرح کا خیال گذرا تھا کہ عورت میں کشش کی جتنی باتیں فطرت نے ودیعت کی تھیں، یا ابتدا سے آج تک اچھے اور بڑے شعرا نے دریافت کی تھیں، ان کے بعد بھی کچھ باقی رہ گیا تھا، جس کو مجسمہ ساز نے

پورا کر دیا تھا!

مدتوں بعد، یاد نہیں آتا کسی سلسلے میں ایک دفعہ پھر مصطفیٰ کاسل جانا ہوا، نقشہ ہی بدلا ہوا تھا، عمارت، باغ، درخت سب کہنگی، ویرانی اور افسردگی کی زد میں تھے، سوا نواب صاحب کی شگفتگی کے جو زمانے کی لائی ہوئی کسی زبونی اور ابتری سے متاثر نہ تھی، آج دفعۃً سننے میں آیا کہ نواب صاحب رحلت فرما گئے! مصطفیٰ کاسل ڈھے گیا جس میں کتنی اور کیسی کیسی یادیں دفن ہو گئیں، محبت و مروت کی یادیں، مہمان نوازی اور وضعداری کی یادیں، غیرت و حمیت کی یادیں، شرافت اور شفقت کی یادیں! ایک شخص کے زندہ رہنے سے کتنی اقدار اور روایات کو فروغ تھا، اس کے اٹھ جانے سے کتنی شمعیں بے نور اور محفلیں سونی ہو گئیں!

کہاں ہے آج تو اے آفتاب نیم شبی!

تقسیم ملک سے پہلے کی تقریباً تیس بتیس سال کی قومی سرگرمیوں میں نواب صاحب کی خدمات کا مسلسل اور معتدبہ حصہ رہا ہے، خلافت کی تحریک میں پیش پیش تھے، مسلم لیگ کے اعیان و اکابر میں سے تھے، مسلم یونیورسٹی کے ٹریژرر اور وائس چانسلر رہے، کوئی غیر معمولی سیاست داں، ماہر تعلیم عالم فاضل یا کسی فن میں یگانۂ روزگار نہ تھے، لیکن ایسی شخصیت کے مالک تھے جس کے بغیر یہ تمام سرگرمیاں نامکمل اور ناقابل اعتبار ٹھہرتی ہیں!

مسلم لیگ کے آزمودہ کار اور معتقد رکن ہونے کے باوجود مسلم لیگ میں اتنے قابل اعتنا نہیں سمجھے گئے، جتنے کہ وہ مستحق تھے، سبب یہ تھا کہ سیاست میں شخص کو نہیں مصلحت کو دیکھتے ہیں، لیگ کی مصلحت اور طریقۂ کار سے بحیثیت مجموعی نواب صاحب کی سیرت و شخصیت ہم آہنگ نہ ہو سکی، نواب صاحب نے اپنے لیے ایک سطح مقرر کر لی تھی جس سے وہ کسی حال میں نیچے اترنا گوارا نہیں کر سکتے تھے، ان کی زندگی میں اکثر ایسے مواقع آئے جہاں انھیں اس اصول، مزاج یا

طریقۂ کار کی خاطر ان کو نقصان اٹھانا پڑا اور حریفوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، لیکن نواب صاحب اس طرح کی شکست کو اپنی فتح سمجھتے تھے، اس لیے بددل اور بیزار ہونے کے بجائے ہمیشہ شگفتہ اور شاداں رہے، نواب صاحب پارٹی نہیں بنا سکتے تھے اور پارٹی بنائے بغیر پبلک لائف کے نشیب و فراز سے عزت اور عافیت سے گذرنا تقریباً ناممکن ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے، نواب صاحب مدتوں علی گڈھ سے وابستہ رہے اور بڑے ذمے دار عہدوں پر فائز، اس میں شک نہیں اس زمانے میں (تقسیم ملک سے پہلے) مسلم یونیورسٹی کا کاروبار اتنا پھیلا ہوا نہ تھا اور نت نئے مسائل کا اتنا سامنا نہ تھا، جتنا آج ہے، پھر بھی انتظامی دشواریاں کچھ کم نہ تھیں، یونیورسٹی کی آمدنی بہت کم تھی، ایک ترقی پذیر معیاری ادارے کے لیے مالی دشواری بہت بڑی مصیبت ہے، اسٹاف کی کمی، سامان کی کمی، عمارات کی کمی، گرانی کے سبب سے ملازموں کی تنخواہوں میں اضافے کی ضرورت، اس قسم کے کتنے اور مسائل تھے، جن کا یونیورسٹی کو سامنا تھا، باایں ہمہ نواب صاحب کی شرافت، بے لوثی اور حسن سلوک کا ایسا اثر تھا کہ کسی دشواری نے پیچیدگی یا ناگواری کی صورت کبھی نہیں اختیار کی، ادنیٰ ملازمین سے لے کر اعلیٰ عہدے داروں تک سبھی تو نواب صاحب پر بھروسا کرتے تھے، اور خود نواب صاحب سب سے عزت اور محبت سے پیش آتے تھے، کسی کے پاس حاجت لے کر جائیے تو نفس کو بالعموم غیرت کا احساس ہوتا ہے، لیکن نواب صاحب اس وقار سے ملتے تھے، اور اس دلسوزی سے پرسشِ احوال کرتے اور مدد پر آمادہ ہو جاتے تھے کہ ذلت کے بجائے آدمی اپنے آپ کو گرامی محسوس کرنے لگتا تھا، نواب صاحب اتنے اچھے تھے کہ کوئی برا شخص بھی اپنے آپ کو آسانی سے اس پر راضی نہیں کر سکتا تھا کہ ان کی برائی پر آمادہ ہو جائے!

ایک دن نواب صاحب کلکٹر ضلع کے ہاں لنچ پر مدعو تھے، شاید کسی منسٹر کے اعزاز میں

یہ تقریب تھی، اس زمانے میں شاید یونیورسٹی کی اپنی کوئی کار نہ تھی، معلوم نہیں کہاں سے ایک خستہ و خوار جیپ آئی، وقت تنگ تھا، نواب صاحب عجلت میں تھے، کوٹھی سے نکلے ہی تھے کہ ایک صاحب آتے ہوئے نظر آئے، موٹر روک دی، معلوم ہوا کہ عارضی ملازم تھے، تنخواہ کے روپیے ملنے میں کوئی پیچیدگی پڑ گئی تھی، اور آفس والوں نے ان کو چکر میں ڈال رکھا تھا، نواب صاحب نے ان کو گاڑی میں ساتھ بٹھالیا، وکٹوریہ گیٹ پر لائے اور کہا کہ اوپر جاکر متعلقہ کلرک کو بلا لائے، وہ آئے تو وہیں آرڈر لکھ کر دیا اور فرمایا کہ ٹریزرر صاحب سے میرا اسلام کہنا اور چک پر دستخط کراکے ان صاحب کے حوالے کر دینا، اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، لنچ سے واپسی پر پھر گیٹ پر آئے اور دریافت کرایا کہ چک دیدیا گیا یا نہیں، اطمینان ہوگیا تو کوٹھی پر واپس آئے۔

نواب صاحب نے اپنے ٹریزررشپ کے عہد میں یہ اسکیم پیش کی تھی کہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور عمال کو یونیورسٹی کی حدود میں ذاتی مکان بنا کر مستقلاً آباد ہوجانے کے لیے قطعات زمین دیے جائیں اور مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں، مقصد یہ تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے پر بھی اساتذہ کا بالواسطہ تعلق اس ادارے سے رہ سکے، ان کی ہمہ وقت موجودگی سے طلبہ کو ہر طرح کا فائدہ پہنچے گا، اور یونیورسٹی میں ایسی فضا پیدا ہوجائے گی جو یہاں کی علمی، تعلیمی اور تہذیبی روایات کو صحت مند اور تازہ کار رکھے گی، ہندوستان کی اقامتی درسگاہوں میں مسلم یونیورسٹی کا یہ اقدام اپنی نظیر آپ تھا، خیال کیا جاتا تھا کہ اس منصوبے کے بروئے کار آنے پر اس درسگاہ کی دیرینہ اقامتی حیثیت کو اور زیادہ فروغ نصیب ہوگا، یونیورسٹی نے اس اسکیم کو منظور کرلیا، چنانچہ مقررہ شرائط پر کافی لوگوں نے بڑے شوق اور حوصلے سے قطعات زمین لیے اور مکان بنوائے، پھر معلوم نہیں کیا صورت پیش آئی کہ کچھ دنوں بعد اس اسکیم کو ختم کر دیا گیا، ۱۹۴۷ء کے رستاخیز میں وہ لوگ بھی ادھر ادھر ہوگئے جنھوں نے مکان بنوالیے تھے، چنانچہ اس اسکیم سے

جو فوائد مرتب ہونے والے تھے وہ نہ ہوسکے۔

اس زمانے میں اسٹاف کے لوگ یونیورسٹی کے اس اقدام پر بہت خوش ہوئے تھے، اور اس کا عام چرچا تھا کہ نواب صاحب کو ادارے کے اساتذہ اور عمال کا کتنا خیال تھا، ان کے لیے ان کے قلب میں کتنی وسعت تھی، اور جہاں تک یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کا تعلق تھا، ان کی نظر کتنی دور رس تھی۔

نواب صاحب بڑے سیر چشم تھے، ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا، اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانے پر بیٹھے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے مہمانوں کی موجودگی، شرف اور شادمانی کی کوئی تقریب تھی، کھانے انواع اقسام کے ہوتے، کھانے والے بھی ہر طرح کے ہوتے، یہ نہیں کہ ہر روز "معزز مہمانوں" ہی کا مجمع ہوتا، ہر روز تو معزز مہمان کسی کے ہاں نہیں ہوتے، نواب صاحب کے ہاں کا دستور یہ تھا کہ خود ان کے یا سرکاری جتنے ملازم یا کام کرنے والے ہوتے اور آس پاس ان کے بیوی بچے ہوئے تو وہ سبھی نواب صاحب کے مطبخ سے کھانا کھاتے، یہی نہیں بلکہ کھانے، ناشتے کا وقت ہوا اور کوئی کلرک یا چپراسی پہنچ گیا جو نواب صاحب کے کلرک یا چپراسی کا شناسا ہوا تو وہ بھی کھانے میں شریک ہوگیا، اس طور پر نواب صاحب ہی نہیں ان کے ملازمین اور متوسلین کا دسترخوان بھی کچھ کم وسیع نہ ہوتا، صورت حال کچھ اس طرح کی تھی کہ نواب صاحب کی میزبانی تو "شرح متین" تھی، ملازمین اور متوسلین کی حیثیت "ضمنی میزبان" کی ہوتی!

یہ وصف ان کا خاندانی تھا، اور جاگیرداری یا سرمایہ داری سے وابستہ نہ تھا جس نے وفا نہ کی، مہمان نوازی اور وضعداری کے اوصاف نے نواب صاحب کا ساتھ مرتے دم تک دیا، ان اوصاف کا نباہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، نواب صاحب شروع سے آخر تک مالی دشواریوں میں مبتلا رہے، جوں جوں دن گزرتے گئے، یہ دشواریاں بڑھتی گئیں، آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ

کسی وقت بھی پانی سر سے اونچا ہو سکتا تھا، لیکن حیرت اس پر ہے کہ نواب صاحب کی کسی بات سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ ان پر کیا گزر رہی ہے، تنگ حال ہونا اور اس کا اظہار نہ ہونے دینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اقتدار کو پہنچنا اور آپے میں رہنا!

نواب صاحب بڑے اونچے درجے کے ارسٹوکریٹ تھے جس کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ کیسی ہی تکلیف یا پریشانی میں کیوں نہ مبتلا ہو اس کا اظہار اس کی کسی بات سے نہ ہو، ہمارے ہاں ادنیٰ درجے کی بھی ارسٹوکریسی ملتی ہے، لیکن جس بات کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یونان کے عہد اولین کی ارسٹوکریسی (اشرافیت) ہے جو وہاں کے دیوتاؤں کا درجہ اختیار کر چکی تھی،

مہمانوں کی تواضع و تکریم، اولاد کی تعلیم و تربیت، گھر کی زندگی کو خوبصورتی اور خیر و برکت سے مالا مال رکھنے میں نواب صاحب کی بیگم صاحبہ کو بڑا دخل تھا، پردہ نشین، باوقار، خدا ترس، خوش مزاج اور بڑی نفاست پسند بی بی تھیں، یونیورسٹی میں غریب عورتوں کا سہارا تھیں، آج تک یہاں کے نچلے طبقے کے ملازمین، ان کی بیوی بچے، بیگم صاحبہ کی دلنوازی اور داد و دہش کا ذکر بڑی محبت اور حسرت سے کرتے ہیں، موقع آئے تو ان میں کسی نہ کسی کو یہ کہتے ضرور سنیں گے کہ کھانے پینے اور عزت و آرام کے مزے تو نواب اسمٰعیل خاں صاحب کی بیگم صاحبہ کے زمانے میں اٹھائے! کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ اولاد کی تقدیر بنانے میں والدین کو بڑا دخل ہوتا ہے، گو اب یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ والدین کی تقدیر بگاڑنے میں اولاد کا دخل کچھ کم نہیں ہوتا! لیکن جہاں تک نواب صاحب کی اولاد کا تعلق ہے، یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت ان کو زندگی میں جو ہمہ جہت شہرت اور وقعت نصیب ہے، اس میں نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے فیض تربیت اور خاندان کی اعلیٰ روایات کا بڑا حصہ ہے!

نواب صاحب مجھ پر کتنا کرم کرتے تھے، اور میرے بچوں اور عزیزوں سے کس محبت اور عزت سے

پیش آتے تھے، جی چاہتا ہے اس کا تذکرہ تفصیل سے کروں، اس سے نواب صاحب کی شفقت، حق پسندی اور وضعداری کی کیسی قابل قدر مثالیں سامنے آ سکتی ہیں، لیکن کرتا ہوں تو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس میں خودستائی اور خودنمائی کا بھی پہلو نکلتا ہے، جو ممکن ہے کسی اور موقع پر گوارا کر لیتا، یہاں اس کی کسی طرح ہمت نہیں ہوتی، اور نہ کروں تو غیرت دامنگیر ہوتی ہے کہ وہ حق نہیں ادا کر رہا ہوں جو نواب صاحب کا مجھ پر ہے!

نواب صاحب کی فرد اعمال تو خدا کے علم میں ہے، اور نجات اُخروی کا سررشتہ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، لیکن نواب صاحب کی محبت و منزلت سے میرا دل جس قدر معمور ہے اس سے امید کرتا ہوں کہ مرحوم کو خدا اپنی بے پایاں بخششوں سے ضرور نوازے گا، میرا کچھ اس طرح کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنی بخشش کی بشارت اس محبت سے بھی دیتا ہے جو وہ اپنے نیک بندوں کی طرف سے اپنے بعض گنہگار بندوں کے دل میں ڈال دیتا ہے!

ادبیات

غزل

از جناب مرزا احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڈھ

اس درد سے جو دل میں سرِ شام بہت ہے
لینا ہمیں تا وقتِ سحر کام بہت ہے

دل گرچہ یہ درماندہ و ناکام بہت ہے
پُر کیف محبت کا یہ انجام بہت ہے

بخشا ہے جو مجھکو مری اس تشنہ لبی نے
وہ کیف مجھے بے مے گلفام بہت ہے

بے سود تگ و دو ہے یہ سب رہرو ناداں
مستانہ جو اٹھ جائے تو اک گام بہت ہے

کچھ جراَتِ رندانہ ہی درکار ہے، ورنہ
سرگرم عمل فتنۂ ایام بہت ہے

یہ مے جو چھلکتی ہے ترے شیشۂ دل میں
ڈھونڈھ ان کی نظر کو کہ ابھی خام بہت ہے

جنبش تو ذرا دیجئے ہلکی سی نظر کو
میرے لیے وہ آپ کا پیغام بہت ہے

سجدوں سے تو انکار نہیں میری جبیں کو
دلکش یہ مگر شغلِ مے و جام بہت ہے

اس پستی احساس کو کیا تیری دعا دوں
مانا کہ قفس میں تجھے آرام بہت ہے

آئینِ محبت میں بجز ان کی خوشی کے
ہر خواہشِ دل قابلِ الزام بہت ہے

رندوں پہ یہ کیا خندۂ تحقیر ہے زاہد
بے وجہ بھی کچھ ان کا کرم عام بہت ہے

کچھ شمعِ یقیں ہی کو ضیا ہوگی یہ روشن
پھیلی ہوئی تاریکیٔ اوہام بہت ہے

آزاد نہ سمجھے کوئی ہم اہلِ جنوں کو
اس راہ میں پابندیِ احکام بہت ہے

ہو غیر کی بخشش تو نہ لے ساغرِ جم بھی
اپنا ہے تو ٹوٹا ہوا اک جام بہت ہے

تسکین تو کچھ ہو نہ سکی قلب و نظر کو
اس دانش و حکمت کا فقط نام بہت ہے

اک شاخِ نشیمن ہی تو ہے، وہ بھی شکستہ
کیوں برق مگر لرزہ براندام بہت ہے

خادم ہیں کسی کے نہ ہیں مخدوم کسی کے
ہم خاک نشینوں کو تو آرام بہت ہے

احسانِ سیہ کار تو در پردہ ہے کچھ اور
گو حلقۂ زہاد میں بدنام بہت ہے

غزل

جناب فضا ابن فیضی

چاکِ بلبل کا گریباں نہیں دیکھا جاتا
مجھ سے یہ جورِ بہاراں نہیں دیکھا جاتا

کچھ تو ہو عشق کی آشفتہ مزاجی کا علاج
دردِ بے منتِ درماں نہیں دیکھا جاتا

انکی آنکھیں بھی ہیں اب اشکِ فسوں سے لبریز
یہ مآلِ غمِ پنہاں نہیں دیکھا جاتا

اپنی بربادیٔ دل مجھ کو گوارا ہے مگر
تیری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا جاتا

یہ سلگتے سے شگوفے یہ دہکتی سی روش
حاصلِ فصلِ بہاراں نہیں دیکھا جاتا

عین دریا میں ہے کچھ موج و تلاطم کی بہار
لبِ ساحل تو یہ طوفاں نہیں دیکھا جاتا

اہلِ بینش بھی ہیں محرومِ فراستِ نظری
کم نگاہی کا یہ عنواں نہیں دیکھا جاتا

چاکِ دامانیٔ انساں کے تبسم کی قسم
زخمِ تہذیب کا عریاں نہیں دیکھا جاتا

یہ تمدن کے ضیا بار چراغوں کی بہار
اے فضاؔ اب یہ چراغاں نہیں دیکھا جاتا

مطبوعات جدیدہ

سنن دارمی شریف ۔ بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، رنگین گرد پوش، مجلد ضخامت ۷۹۶ صفحات، ناشر محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

سنن دارمی اپنی صحت، شہرت اور اپنے مؤلف ابو محمد عبد اللہ دارمی کی محدثانہ عظمت کے باعث کتب حدیث میں خاص امتیازی حیثیت رکھتی ہے اور مستند سمجھی جاتی ہے، غالباً اب تک اردو میں اس کا ترجمہ نہیں ہوا تھا، محمد سعید اینڈ سنز نے جو حدیث کی کئی اہم کتابوں کا ترجمہ شائع کر چکے ہیں، اب سنن دارمی کا ترجمہ شائع کیا ہے، ترجمہ اگرچہ صاف اور سلیس ہے، لیکن اس کی اشاعت کا اصلی منشا عوام اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کو تعلیمات نبوی سے آشنا کرنا ہے، اس لیے ترجمہ میں اور زیادہ روانی وسلاست اور کتابت وطباعت میں صحت کے اہتمام کی ضرورت تھی، تاہم یہ ترجمہ بھی مفید ہے خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ انکار حدیث کا فتنہ پورے عروج پر ہے، ترجمہ سے پہلے امام دارمی کے مختصر حالات، سنن اور عام علم حدیث کی خصوصیات، اہمیت اور تاریخ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب الاخلاق
کتاب المعاشرت
مرتبہ جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات بالترتیب ۲۲۴ و ۱۷۶۔ رنگین گرد پوش، مجلد قیمت بالترتیب عکر و عا پتہ: محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب، قرآن محل، مقابل مسافر خانہ، کراچی۔

مفتی انتظام اللہ صاحب مشہور اہل قلم ہیں، ان کی ان دونوں تالیفات کا مقصود یہ ہے کہ

مسلمان عقائد وعبادات کے مسائل کی طرح اخلاق، معاشرت اور معاملات وغیرہ کے احکام ومسائل سے بھی واقف اور ان پر عمل پیرا ہوں، چنانچہ اول الذکر کتاب میں مختلف اخلاقی فضائل ورزائل اور مؤخر الذکر میں نظافت، حفظان صحت، ملاقات، نشست وبرخاست، لباس، طعام، نکاح، باہمی حقوق، صنعت، معیشت اور زراعت وغیرہ سے متعلق احادیث اور آیات قرآنی ترجمہ کے ساتھ نقل کی گئی ہیں، کتاب عام مسلمانوں کے لیے لکھی گئی ہے، اس لیے زبان وبیان آسان اور عام فہم ہے، ان دونوں کتابوں کا مطالعہ عام مسلمانوں کے لیے مفید ہوگا۔

سوانح عمری خواجہ حسن نظامی :۔ مرتبہ ملا واحدی صاحب، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۲۴، مجلد قیمت لائبریری اڈیشن سے، قسم اول سے، قسم دوم عجر، پتہ: درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، نئی دہلی۔

حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم کی شہرت ایک صوفی اور صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے محتاج بیان نہیں، ملا واحدی صاحب اور ان کا تقریباً نصف صدی تک ساتھ ہی نہیں بلکہ گہرا تعلق رہا ہے، اسلیے خواجہ صاحب کی سوانح نگاری کا حق ملا صاحب ہی ادا کر سکتے تھے، چنانچہ ابھی انھوں نے اس کا پہلا حصہ لکھا ہے، جس میں خواجہ صاحب کے ابتدائی حالات وواقعات، ان کے اسفار، مختلف لوگوں سے تعلقات، جوش عمل، مجاہدانہ عزم اور تبلیغی کاموں وغیرہ کا تذکرہ، اپنے مشاہدات اور خواجہ صاحب کے روزنامچوں کی روشنی میں کیا ہے، خواجہ صاحب ایک صوفی مشرب انسان تھے، اس لیے ان کے بعض عقائد وخیالات ہر شخص کے لیے قابل قبول نہیں ہیں، خود واحدی صاحب نے سجدۂ تعظیمی کے جواز میں ان کی رائے سے اختلاف کیا ہے، مگر ان کی زندگی بڑی سبق آموز اور دلآویز تھی اور ملا واحدی صاحب کے عقیدت کیش قلم اور انکی پاکیزہ اور ستھری زبان نے اس لطف کو اور دوبالا اور کتاب کو نہایت دلچسپ اور مؤثر ودلکش بنا دیا ہے۔ اور اس سے خواجہ صاحب کی سوانحعمری کے ساتھ گذشتہ نصف صدی کی تاریخ کا ایک دھندلا نقش

بھی سامنے آجاتا ہے، اس لیے یہ کتاب سوانحمری بھی، تاریخ بھی اور قارئین کے لیے درسِ عمل بھی ہے،

بدعت کیا ہے:- چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۰، قیمت ۳ے

ناشر مکتبۂ تجلی، دیوبند، یوپی۔

یہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، بلکہ فاران کے توحید نمبر کے چار مقالات نقشِ اول (ماہر القادری صاحب)[1] الوسیلہ کا حقیقی مفہوم (محترمہ عطیہ خلیل عرب)[2] قبر پرستی (مولوی شیخ احمد صاحب)[3] اور بدعت توحید کی ضد ہے (مولوی عامر عثمانی صاحب) کا مجموعہ ہے، یہ چاروں مقالات مفید اور قیمتی ہیں، خصوصاً دوسرا مقالہ اپنی جامعیت اور ایجاز کے اعتبار سے سب میں بہتر ہے، لیکن تیسرا اور چوتھا مقالہ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے، اور ان کو الگ شائع کرنے کے لیے ان میں ترمیم کی ضرورت تھی، کیونکہ ان میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں، آخری مقالہ میں بدعت کی مروجہ شکلوں کی تردید کی گئی ہے، اور بعض جگہ بڑی انتہا پسندی سے کام لیا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بدعت سے محفوظ رہنا بڑا کمال ہے، اسی طرح کسی شے کے شرک و بدعت ہونے کا فیصلہ کر دینے میں بھی بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، مثلاً ایک جگہ لائق مقالہ نگار فرماتے ہیں "مگر کسی وقت کے ساتھ انھیں (فاتحہ و اخلاص کو) خاص اور پابند کر دینا ایجاد و بدعت شمار ہوگا" ممکن ہے فاضل مقالہ نگار نے جس خاص صورت کے سلسلہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے وہ صحیح ہو، لیکن اس کی تعمیم صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ خود احادیث و آثار سے بعض سورتوں کو بعض اوقات سے مخصوص کرنے کا ثبوت ملتا ہے، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فجر اور طواف کی رکعتوں میں قل یا ایہا الکافرون اور قل ہو اللہ احد پڑھا کرتے تھے، اسی طرح ایک صحابی جو نماز پڑھاتے تھے ہر سورہ کی قرأت کے بعد آخر میں قل ہو اللہ بالالتزام پڑھتے تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی گئی تو آپ نے سبب معلوم کرنے کے بعد فرمایا حبك ایاها ادخلك الجنة[1]

---

[1] جواب اہل الایمان لابن تیمیہ بحوالہ الصحیحین ص ۷۰، مرتب مقالہ کو اس ضمن میں اس رسالہ کے بعض اور مباحث خاص طور سے دیکھنا چاہیے۔

ان خفیف خامیوں سے قطع نظر یہ مقالات بڑے مفید اور مسلمانوں کے مطالعہ کے لائق ہیں۔

انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد مرتبہ جناب محمد مسعود صاحب جوہری بی اے، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۲۸، مع رنگین گرد پوش، مجلد قیمت ۱۶؍ ناشر مکتبۂ برہان اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔

انقلاب روس یعنی زار کی شاہی سلطنت کا خاتمہ اور اشتراکی نظام کا قیام دنیا کا اہم ترین اور بڑا عبرتناک واقعہ ہے، لائق مرتب نے اس کتاب میں اس انقلاب کی تفصیلات دو حصوں میں بیان کی ہیں، پہلے حصہ میں انقلاب کا ذکر ہے، اور اس سلسلہ میں روس کی عام حالت، ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم، فروری کے عارضی انقلاب، اکتوبر کے اشتراکی انقلاب، لینن کی سوئزرلینڈ کی جلاوطنی سے واپسی، مجلس دستور ساز، جرمنی سے روس کی صلح، معاشی ابتری، خانہ جنگی، سرمایہ دار ممالک کی ریشہ دوانیوں، بولشوک کی اسلامی ریاستوں، حکمراں طبقہ کی نشو و نما اور لینن کی وفات وغیرہ کا بھی تذکرہ آگیا ہے، دوسرے حصہ میں انقلاب روس کے بعد کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے، اور اس ضمن میں ٹراٹسکی، اسٹالن اور بعض دوسرے عظیم اشخاص کے باہم اختلاف، اسٹالن کی کامیابی اور اپنے مخالفین کی بیخ کنی، اقتصادی حالات، سوویٹ روس اور مغربی ممالک کے اختلاف، کشمکش اور تعلق، دوسری جنگ عظیم، فن لینڈ اور روس کی جنگ، جرمنی اور روس کی جنگ، سرخ فوج کی فتوحات، اٹلی کے زوال، اتحادیوں کے اختلافات اور نازی جرمنی کی شکست وغیرہ کا ذکر ہے، اس حصہ میں مصنف نے اگرچہ اصل اشتمالیت کی تائید کی ہے لیکن پوری غیر جانبداری کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اسٹالن نے لینن کے مرنے کے بعد اشتمالی اصولوں کو ترک کر دیا تھا، جس سے صحیح مارکسزم روس میں قائم نہ ہو سکا۔ یہ کتاب اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس موضوع پر اب تک اردو میں اتنی مفصل کوئی کتاب موجود نہیں تھی، جو لوگ انقلاب روس کی تاریخ اور اس کے بعد کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہوں ان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

نو بہاراں ۔ جناب اثر لکھنوی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۴۲،
مع گرد پوش قیمت عہ/ مکتبۂ دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔

یہ جناب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کی غزلوں کا تیسرا منتخب مجموعہ ہے جس میں ۳۹ء سے لیکر ۵۵ء تک کی غزلوں کا انتخاب شامل ہے، انتخاب کے فرائض پروفیسر سید احتشام حسین اور جناب نجم الدین شکیب جیسے باذوق اصحاب نے انجام دیے ہیں، جناب اثر کی شخصیت اور انکا کلام توصیف سے بالاتر ہے، یہ پورا مجموعہ ان کی استادی، مہارت فن اور اعلیٰ ترین مذاق شاعری کا نمونہ ہے، چونکہ یہ مجموعہ غزلیات پر مشتمل ہے اسلیے جناب اثر کی زبان سے غزل کی تعریف اور نظم و غزل کا لطیف فرق سن لینا چاہیے ؎

غزل کو نظم نہ کہیے غزل ہے اور ہی چیز — وہ ہے حیات یہ نبض حیات کی دھڑکن
وہاں کلام میں بوئے سمن کی مستی ہے — یہاں کلام سے ہوتی ہے مست بوئے سمن

یہ پورا مجموعہ حضرت اثر کی استادی کے ساتھ پاکیزہ تغزل، حسن ادا، حسن ترکیب، حسن بیان اور دوسرے شاعرانہ محاسن سے معمور ہے، جناب اثر لکھنوی ہیں لیکن ان کا کلام لکھنوی شاعری کے معائب سے پاک اور میر تقی میر کا رنگ لیے ہوئے ہے، کہیں کہیں سیاسی خیالات کا بھی عکس نظر آتا ہے، غالباً کتابت و طباعت کی غلطی سے "وادی" ص۳۲ اور "بہار" ص۱۲۸ مذکر چھپ گیا ہے، امید ہے کہ ارباب ذوق و نظر اس نو بہار کی رنگینیوں اور لطافتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

دین خالص ۔ مرتبہ مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، صفحات ۶۲، قیمت ۸/ ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی۔

یہ ایک مفید اور مختصر دینی رسالہ ہے جسمیں مولانا کاندھلوی نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ دین اسلام کی اصل حقیقت بیان کی ہے، اور اس ضمن میں خاص طور سے اتباع، اطاعت، محبت و عظمت اور اس سلسلہ کے ضروری امور پر مؤثر اور دلنشین بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ بندگی کے تین مدارج ہیں جن سے عبد و معبود کا تعلق استوار ہوتا ہے اور انسانی فلاح و نجات کا دار و مدار بھی ان ہی پر موقوف ہے۔

"ض"

جلد ۸۲ ماہ ربیع الاول ۱۳۷۸ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۵۸ء نمبر ۴

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۲۴۲-۲۴۴

مقالات

استاذ العلماء حضرت مفتی لطف اللہ صاحب کے علمی کارنامے اور کمالات — جناب مولانا بدر الدین صاحب علوی سابق استاذ عربی مسلم یونیورسٹی — ۲۴۵-۲۶۱

الفریڈ گل لیوم کے ورثۂ اسلام پر ایک نظر — جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے بی ٹی ایچ رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش — ۲۶۲-۲۷۵

چند ناسخ و منسوخ آیات — جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب ندوی مدراسی — ۲۷۶-۲۹۵

قاسم کاہی کا وطن — جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے لکچرار عربی الہ آباد یونیورسٹی — ۲۹۶-۳۱۳

ادبیات

نعت فارسی — جناب برکت علی صاحب منہاس ایم اے لاہور — ۳۱۴-۳۱۵

نعت اردو — زائر حرم جناب حمید صاحب صدیقی لکھنوی — ۳۱۶

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۳۱۷-۳۲۰